Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1985

اس پرچہ میں

۱ ۔ نظریہ ضرورت کا اسلام

۲ ۔ تحریک اسلامی کا نیا منشور

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور ۹

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خط وکتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان -/۴۸ روپے غیر ممالک -/۹۸ روپے
شمارہ ۹	ستمبر ۱۹۸۵ء	جلد ۳۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ نظریۂ ضرورت .... علامہ پرویزؒ صاحب ۹

۳۔ حقائق وعبر :- (۱) تحریک اسلامی کا نیا منشور ۱۹
(۲) مولانا تھانوی اور انکا مرید (۳) بزرگوں پر بہتان
(۴) اہل حدیث اور تبلیغی جماعت (۵) نہ وہ عشق
میں رہیں گرمیاں (۶) جماعت اسلامی کی سیاست

۴۔ دین کی باتیں! (ثریا عندلیب صاحبہ) ۲۵

۵۔ امّت مسلمہ کیلئے عالمی ادارہ کی ضرورت ۳۰

۶۔ قرآن کا عدالتی نظام ۳۳
(شاہد عادل از میانوالی)

۷۔ ایسا کہاں سے لاؤں؟ ۳۷
(محمد صادق صاحب (بزم طلوع اسلام گوجرانوالہ)

۸۔ ایک میجر جنرل کے تاثرات (احسان الحق ملک) ۴۱

۹۔ منکرِ قرآن کے ایک ذاتی معالج کے تاثرات ۴۹
(ڈاکٹر صلاح الدین اکبر۔ (قسط دوم)

۱۰۔ قرآنی درس کے اعلانات ۵۵

۱۱۔ افکار پرویزؒ کی صدی ۵۶
(محمد اسلام صاحب)

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبد الحمید، مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس، ۹۔ ایک روڈ لاہور

لمعات

جب سے موجودہ نسل نے آنکھ کھولی ہے وہ علماء اور سیاسی لیڈروں کی زبانی یہ دعوٰے سن رہی ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں واضح احکامات موجود ہیں، اس دعوٰے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک نوجوان نسل کے سامنے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات ثابت کرنے کے لئے انسانی معاشرے کے تمام پہلوؤں، بالخصوص مالیاتی معاملات کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی پوری تفصیلات پیش نہیں کی گئیں۔ جس کی وجہ سے وہ اسلامی ضابطہ حیات کے مکمل ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے اور وقتاً فوقتاً اپنے شبہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

موجودہ دور بلاشبہ معاشیات کا دور سمجھا جاتا ہے اور انسانی معاشرے کے معاشی پہلو نے آج اتنی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ مختلف ممالک کے سیاسی نظاموں کو بھی اس کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف ممالک پہ دو معاشی نظاموں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ غلبہ ہے۔ یہ نظام کمیونزم اور سرمایہ داری ہیں۔ کمیونزم میں ذرائع پیداوار حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں اور حکومت ہی ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا خود انتظام کرتی ہے۔ اس نظام حکومت کا دعوٰے تو یہ ہے کہ وہ معاشرے کے ہر فرد سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیتی ہے اور اس کی ضروریات کے مطابق اس کے اخراجات کا بندوبست کرتی ہے۔ تاہم کمیونزم سے وابستہ ممالک کے جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممالک ابھی تک اپنے اس دعوٰے کو حقیقت کا روپ نہیں پہنا سکے۔ ویسے چونکہ ایسے معاشرے میں سب انسانوں کی ضروریات کی ذمہ داری کا پورا کرنا حکومت کے ذمے ہوتا ہے، اس لئے طبقاتی تفاوت زیادہ نہیں ہوتا اور معاشرے میں کسی خاص طبقے کے لئے عیش و عشرت کے مواقع بڑے کم ہوتے ہیں

اس کے مقابلے میں سرمایہ داری نظام میں ذرائع پیداوار، سرمایہ دار طبقے کے قبضے میں ہوتے ہیں، وہی صنعتی پیداوار کے لئے کارخانے قائم کرتے ہیں اور زراعت کا انتظام کرتے ہیں۔ اپنے کارخانے چلانے کے لئے وہ مزدوروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ اس نظام میں سرمایہ دار طبقے کو من مانی کرنے کی چونکہ کھلی چھٹی ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی آمدنی میں اضافے کے لئے مزدور طبقے کے استحصال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں طبقاتی کشمکش

پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش کا فائدہ کمیونزم کے نظام کے داعی اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، سرمایہ داری نظام کے علمبرداروں سے اپنے نظام کی یہ خامی مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے تدارک کے لئے انہوں نے رفاہی مملکت کا تصور پیش کیا۔ اس مملکت میں معاشرے کے تمام بے روزگار افراد کی محدود ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے وہ سرمایہ دار طبقے سے ایک خصوصی ٹیکس یعنی انکم ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس ٹیکس کے سلسلے میں اس اصول پہ عمل کیا جاتا ہے کہ جس سرمایہ دار کی آمدنی زیادہ ہو، اسے زیادہ ٹیکس دینا پڑے اور جس کی آمدنی کم ہو اس پہ ٹیکس کا بوجھ بھی کم ہو۔ چنانچہ اس ٹیکس سے حکومت کو کافی آمدنی حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ رفاہی ریاست کے نظریے کو آسانی سے عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔

آزادی سے پہلے برّ صغیر ہندو پاکستان پہ انگریزوں کی حکومت تھی، جو سرمایہ داری نظام کے علمبردار تھے۔ چنانچہ پاکستان کو سرمایہ داری نظام ایک طرح سے وراثت میں ملا ہے لیکن پاکستان اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا تھا، اس لئے جلد یا بدیر یہاں پہ اسلامی نظام کا نفاذ ہی عمل میں آنا تھا، اسی وجہ سے قیامِ پاکستان کے بعد کے اڑتیس سالوں میں یہاں قائم ہونے والی مختلف حکومتیں، اس سمت میں کوئی نہ کوئی قدم اٹھاتی رہی ہیں، لیکن جہاں تک اسلام کے مالیاتی نظام کا تعلق ہے اس بارے میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ اور ابھی تک ملکِ عزیز میں سرمایہ داری نظام کا سکّہ ہی رائج ہے۔ جس کی وجہ سے نئی نسل کے ذہن میں یہ سوال ابھرنا ایک قدرتی امر ہے کہ کیا اسلام کا اپنا مالیاتی نظام نہیں ہے؟ اور وہ بجا طور پہ یہ سوال دہراتے ہیں کہ اگر اسلام واقعی ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے تو اس کا اپنا علیحدہ مالیاتی نظام بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ نوجوان نسل کے اس سوال کا جواب نہ تو علماء کی جانب سے دیا گیا ہے اور نہ ہی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے اس بارے میں ان کی رہنمائی کی ہے۔ حکومت نے اسلامی تحقیق کے چند ادارے قائم کر رکھے ہیں وہ بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ چنانچہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کئی طالب علم اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں جس عالمِ دین یا پروفیسر سے دریافت کیا تو وہ کوئی واضح چیز پیش نہ کر سکے بلکہ سرمایہ داری نظام کے مروجہ مالیاتی نظام کو تھوڑی بہت کمی بیشی کے بعد اسلام کے مالیاتی نظام کے طور پہ پیش کر دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات ہے لیکن جب اس کے مالیاتی نظام کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو اس مقصد کے لئے سرمایہ داری نظام کے مالیاتی نظام کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسلامی ضابطۂ حیات کے اس اہم پہلو کے بارے میں اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے سے نوجوان نسل کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ طلوعِ اسلام نے ہمیشہ ان نوجوانوں کے شکوک

رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ سعادت بھی ________

وہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں مختصراً عرض کیا جاتا ہے:۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں واضح احکامات نازل فرمائے ہیں، جو احکامات اس زمانے کی اسلامی حکومت کی ضروریات کے عین مطابق تھے۔ چونکہ ان کی نوعیت اصولی ہے۔ اس لئے بعد کے مسلمان حکمرانوں نے ان اصولوں کی روشنی میں اسلام کا مالیاتی نظام اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کیا، اسے شرعی اصطلاح میں نظامِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (سورۃ الحج - ۴۱)

ترجمہ:۔ اگر ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کرتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

نظامِ صلوٰۃ کے بارے میں طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے اور اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع بھی کیا جا چکا ہے اس وقت ہمارا موضوع نظامِ زکوٰۃ ہے جو اسلام کا مالیاتی نظام ہے۔ اس بارے میں تمام اصولی ہدایات قرآن مجید میں دی گئی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلعم کو ارشاد ہوا:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (سورۃ التوبہ - ۱۰۲)

(ترجمہ) ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرکے انہیں پاک اور پاکیزہ بنا دو

اسلامی ریاست کی نظامِ زکوٰۃ کے تحت جمع ہونے والی آمدنی کو خرچ کرنے کے بارے میں یہ قرآنی احکامات نازل ہوئے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط

(سورۃ التوبۃ - ۶۰)

ترجمہ:۔ صدقات مخصوص ہیں فقراء کے لئے اور مساکین کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام کریں اور ان کے لئے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو، نیز وہ صرف ہونے چاہئیں غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں، قرضداروں کی مدد میں اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی خبرگیری میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فریضے کے طور پر۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے اخراجات کی جو مختلف مدیں بیان ہوئی ہیں ان کی تشریح کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

فقیر

فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لئے عام ہے، چاہے وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سرِ دست مدد کے محتاج ہوں۔ اور اگر انہیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بیروزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کا شکار ہو گئے ہوں۔ اس ذیل میں وہ کروڑ پتی افراد بھی آسکتے ہیں، جو کسی حادثے کی وجہ سے امداد کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

مسکین

مسکین کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا۔ اور پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسے افراد کو تلاش کرے اور انکی جو ضروریات اور حاجات ہیں انہیں پورا کرے۔ تاکہ وہ اسلامی ریاست کے مفید شہری بن سکیں۔ مسکین کی مدد سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ کسی سائل کو چند روپے دیئے جائیں اور نہ اس سے زکوٰۃ کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت ایسے اقدامات کرے کہ جن سے یہ فقراء اور مساکین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ یعنی ان کی تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور صنعتی ادارے اسی مدِ زکوٰۃ سے کھولے جائیں۔ انہیں مفت علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے ہسپتال قائم کئے جائیں اور جو حاجت مند بے گھر ہوں، اسی مد سے ان کے لئے مکانات تعمیر کئے جائیں وغیرہ۔

عاملینِ زکوٰۃ

ان سے مراد وہ سرکاری ملازم ہیں، جن کے سپرد نظامِ زکوٰۃ کا ادارہ ہوگا، ان سب ملازمین کی تنخواہ اسی مد سے ادا کی جائے گی۔ ان میں تحصیلدار، پٹواری اور محکمہ مال کے دوسرے ملازم خزانچی، محاسب اور دوسرے سب لوگ شامل ہیں۔ ہمارے فقہاء نے بعض ایسے لوگوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے جو بظاہر عاملینِ زکوٰۃ کی تعریف میں نہیں آتے۔ انہوں نے قاضی اور اس قسم کے دوسرے سرکاری ملازمین کہ جن سے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس میں شامل قرار دیا ہے۔ فقہا کی اس تصریح کے مطابق عدلیہ کے پورے نظام کے اخراجات، زکوٰۃ کی مد سے پورے کئے جاسکتے ہیں۔

(بدایۃ المجتہد از امام رشد جلد اوّل صفحہ ۲۶۷)

مولفۃ القلوب

یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ تالیفِ قلب کے معنی ہیں دل جوڑنا۔ اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ یا جو لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے ہوں اور انکی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے

اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی مدد نہ کی گئی تو وہ پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، تو اس مد سے ان کی مالی مدد کی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ مسلمان، فقیر، مسکین یا مسافر ہوں، بلکہ اغنیاء پر اس مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے اور خود رسول اللہ صلعم نے اغنیاء پر اس مد سے خرچ کیا تھا۔

غلام آزاد کرانے اسلام سے پہلے غلامی کا عام رواج تھا اور مسلمان معاشرے میں بھی ان کا وجود پایا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ اسلام اس لعنت کو ختم کرنا چاہتا تھا اس لئے نظامِ زکوٰۃ کی مد سے خرچ کر کے اسلامی معاشرے میں موجود غلاموں کو آزاد کرانے کا حکم دیا۔

قرضدار اس مد سے مراد ایسے قرضدار ہیں کہ جو اگر اپنا پورا قرض ادا کر دیں، تو ان کے پاس قدرِ نصاب سے کم مال بچتا ہو۔ زکوٰۃ کی آمدنی سے ان کی بھی مدد کی جا سکتی ہے۔

فی سبیل اللہ اس کے لفظی معنی تو راہِ خدا میں خرچ کرنے کے ہیں لیکن اسلام میں راہِ خدا عام ہے اور اس کے مفہوم میں نیکی کے وہ تمام کام جن سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی مقصود ہو، شامل ہیں، اس لئے مفسرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس مد سے ہر قسم کے نیک کام پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کے ظاہر لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مد تمام تر فوجی اخراجات کے لئے مخصوص ہے۔ اسی بنا پر علامہ قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہا کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کو مُردوں کی تجہیز و تکفین قلعوں (موجودہ چھاؤنیوں) کی تعمیر مساجد کی آبادکاری وغیرہ پر خرچ کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، کیونکہ فی سبیل اللہ کے الفاظ سب کے لئے عام ہیں۔

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ ۴۶۴)

موجودہ دور کے مشہور مفسرِ قرآن علامہ رشید رضا نے نظامِ زکوٰۃ کے اخراجات کی اس مد کی یہ تفسیر بیان کی ہے۔

فی سبیل اللہ سے مراد وہ تمام شرعی مصالح ہیں، جن پر دین و حکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اوّل اور سب پر مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لئے اسلحہ خریدا جائے، فوج کے لئے غذائی سامان فراہم کیا جائے، ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے، سپاہیوں کو سامانِ جنگ مہیا کیا جائے وغیرہ۔ (تفسیر المنار جلد اوّل صفحہ ۵۰۵)

ابتدائے اسلام میں انسانی معاشرہ سادہ تھا اور حکومت کی جتنی بھی ذمہ داریاں تھیں، ان سب کو پورا کرنے کے لئے زکوٰۃ کے فنڈ سے ہی خرچ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے علمائے اسلام نے یہ متفقہ فتویٰ جاری کیا کہ اسلامی حکومت کے تمام اخراجات نظامِ زکوٰۃ سے ہی پورے کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے کوئی دوسرا دنیاوی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا۔ (میزان الکبریٰ جلد دوم صـ۲)

ہمارے ہاں عام طور پر نظامِ زکوٰۃ سے مراد نقدی کی زکوٰۃ مراد لی جاتی ہے۔ جب کہ اس میں آمدنی کی دوسری مدات بھی شامل ہیں جیسے کہ عشر، خراج، عشور، خمس وغیرہ ان سب کو ملا کر نظام زکوٰۃ کا نام دیا جاتا ہے، اراضی کی زکوٰۃ اسلامی حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا اور حکومت کے زیادہ تر اخراجات اسی مد سے پورے ہوتے تھے۔ عُشر کو فقہ کی اصطلاح میں زکوٰۃ الارض بھی کہتے ہیں اور اس بارے میں قرآن مجید میں واضح احکامات دیئے گئے ہیں، علامہ پرویز صاحب مرحوم' قرآن مجید کی روشنی میں اس مد کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" سوال یہ ہے کہ معاشرہ اپنی عظیم ذمہ داری کو پورا کسطرح کرے گا۔ اس کے لئے ایک چیز بالکل واضح اور بدیہی ہے اور وہ یہ کہ معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآء ہو نہیں سکتا، جب تک کہ وسائل پیداوار پر اس کا کنٹرول نہ ہو، وسائل و ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے (اشیائے خوردونوش کے علاوہ جملہ مصنوعات کے لئے خام مصالحہ یہیں سے ملتا ہے) اس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے :۔

وَ الارضَ وضَعَهَا لِلانام۔ (۵۵–۱۰)

ترجمہ :۔ زمین کو ہم نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو چیز تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنائی گئی ہو، اسے کسی فرد کی ملکیت میں کیسے دیا جا سکتا ہے۔ خدا نے ہوا کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ ہے اگر ہوا کو انفرادی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس سے جسطرح بے شمار مخلوق گھٹ گھٹ کے مر جائے گی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے: بعینہٖ یہی پوزیشن زمین کی ہے اس لئے اس نے کہا کہ اسے انفرادی ملکیت کی بجائے، سَوَاءً لِلسَّائِلِين (۴۱–۱۰) رہنا چاہیئے۔ یعنی اس کا انتظام ایسا کرنا چاہیئے کہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے۔ یہ مَتَاعًا لِلْمُقْوِين ہے یعنی بھوکوں کے لئے متاعِ حیات۔ اس میں رِزْقًا لِلْعِبَاد ہے۔ یعنی خدا کے تمام بندوں کے لئے رزق۔

قرآن کریم کی انہی آیات کی تشریح کرتے ہوئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں، اس لئے اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (بحوالہ سننِ ابو داؤد) لہٰذا زمین کو ایسی حیثیت دے دینا جس سے یہ تمام مخلوق کے لئے مشترکہ ذریعۂ پرورش رہنے کی بجائے کسی فرد یا افراد کی ملکیت اور جائیداد بن جائے اس مقصد کے خلاف ہو گا، جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے، یہ معاشرہ کی تحویل میں رہے گی اور معاشرہ ایسا انتظام کریگا جس سے ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا جائے۔ (خدا اور سرمایہ دار، صفحات ۱۴۴–۱۴۵)

قرآن مجید کی اس اصولی تعلیم کی روشنی میں رسول اللہ ؐ نے زمین کی خرید و فروخت سے منع فرمادیا تھا
(نیل الاوطار تالیف علامہ شوکانی جلد ۵ صـ ۲۹۵)

ابتدا میں اسلامی حکومت، زمین سے صرف دس فیصد زکوٰۃ وصول کرتی تھی جسے اصطلاح میں عشر اور زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں بہت سے ممالک فتح ہو جانے کی وجہ سے اسلامی حکومت کو باقاعدہ فوج ملازم رکھنی پڑی، جس کی وجہ سے حکومت کے اخراجات بڑھ گئے چنانچہ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے ان نئے فتح ہوتے والے ممالک کی تمام اراضی کو بیت المال کی ملکیت قرار دے کر پرانے کاشتکاروں کے پاس رہنے دیا اور ان کے لئے لازمی قرار دیا کہ وہ زرعی پیداوار کا تقریباً نصف حصہ اسلامی بیت المال میں جمع کرائیں۔ اصطلاح میں بیت المال میں جمع ہونے والی اس آمدنی کو خراج کا نام دیا گیا جس کے لفظی معنی بٹائی، کے ہیں۔ تمام صحابہؓ کرام نے آپ کے فیصلے کی تائید کی۔ اور یہ اسلامی قانون بن گیا۔ (کتاب الخراج از قاضی امام ابو یوسف صفحہ ۲۵)

بعد میں امت مسلمہ کے تمام فقہی مذاہب نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو برقرار رکھا اور ہر دور کی اسلامی حکومت کے تمام اخراجات اسی ایک مد سے پورے ہونے لگے۔ ملوکیت کی وجہ سے مسلمان حکمران عیش و عشرت کے دلدادہ ہو چکے تھے، اس لئے عام مسلمان انہیں اپنے مال کی زکوٰۃ دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن زرعی اراضی کی مد سے اتنی زیادہ آمدنی ہوجاتی تھی کہ ان مسلمان حکمرانوں نے اموال کی زکوٰۃ کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

اسلامی تاریخ میں، ملوکیت کے دور کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ کیونکہ مختلف بادشاہوں نے بہت سی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرکے بدعات کا رواج دیا۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود کسی مسلمان بادشاہ نے اسلام کے مالیاتی نظام میں کوئی ردّوبدل نہ کیا۔ زمین، جیسا کہ پرویز صاحب کی وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے، کو ہمیشہ اسلامی حکومت کی ملکیت سمجھا گیا۔ بڑے سے بڑے مسلمان بادشاہ نے انفرادی ملکیت کی اجازت نہ دی اور حکومت کا کاروبار اسی اراضی کے خراج سے چلایا۔

برصغیر ہندوپاکستان کے مسلمان بادشاہوں نے بھی اسلام کے اسی مالیاتی نظام پر عمل کیا۔ لیکن جب انگریزوں نے بنگال فتح کیا تو برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۷۹۳ء میں بنگال کے بندوبست دوامی کے نام سے ایک قانون پاس کیا اور تمام اراضی کو بڑے بڑے زمینداروں کی انفرادی ملکیت بنا دیا۔ اس طرح غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ اور زمین کی وہ آمدنی جو سرکاری خزانے میں جمع ہو کر حکومت کے اخراجات پورے کرنے پر صرف ہوتی تھی اب وہ ان غیر حاضر زمینداروں کی جیب میں جانے لگی۔ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے علیحدہ ٹیکس لگائے گئے جو سرمایہ داری نظام کا خاصہ ہیں۔

(اس کا باقی حصہ صفحہ نمبر ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

نظریۂ ضرورت کا اسلام

ایک اسلام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بوساطت حضور نبی اکرمؐ عطا فرمایا، اور جو قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے۔ اس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ...... صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج ...... (۶/۱۱۶)۔ دین کے اصول و ضوابط مکمل ہو گئے اس لئے ان میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ وہ غیر متبدّل ہیں۔

۲۔ اس کے بعد محدثین نے کہا کہ اسلام، احادیث کے ساتھ مل کر مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے احادیث کو جمع و مدوّن کیا۔ انہیں چھان پھٹک کران کے مدارج مقرر کئے اور کہا کہ صحیح احادیث میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ بخاریؔ کی اور مسلمؔ کی ایک حدیث کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے عقیدہ کی رُو سے بھی دین غیر متبدّل قرار دیا گیا۔

۳۔ پھر فقہا حضرات نے فقہیں مرتب کیں۔ اگرچہ ان کی ترتیب و تدوین کے زمانے میں ان میں ردّ و بدل ہوتا رہا لیکن اس کے بعد اُنہوں نے بھی یہ مسلک اختیار کیا کہ مسلّمہ فقہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

۴۔ لیکن ہمارے زمانے میں ایک اسلام وضع کیا گیا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضرورت اور مصلحت کے مطابق تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے لئے قرآن، حدیث، فقہ میں سے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ سند صرف یہ ہے کہ "ہم نے جو کہہ دیا۔" اس اسلام کی دو چار جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ پارٹی سازی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد (دکن) سے منتقل ہو کر شمالی ہند (دارالاسلام) آئے تو ان کی کوئی پارٹی نہیں تھی۔ وہ ایک ماہنامہ (ترجمان القرآن) کے مدیر کی حیثیت سے متعارف تھے، اور وہ بھی بیشتر اسی علاقہ میں۔ شمالی ہند میں لوگ بہت کم ان سے متعارف تھے۔ جو حضرات ان سے متعارف تھے وہ بھی اس جہت سے کہ وہ اپنے رسالہ میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصوّر اسلام اور اسلامی مملکت کی تائید کرتے تھے۔ لیکن یہاں پہنچنے کے بعد اُنہوں نے اپنا روپ بدل لیا۔ قائدِاعظمؒ نے مسلم لیگ کی تنظیم نو سے اسے ایک مستحکم پارٹی کی حیثیت سے قائم کیا تو مودودی (مرحوم) نے فرمایا کہ مسلمانوں میں الگ الگ پارٹیاں اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ اُنہوں نے ماہنامہ پیغام حق کی فروری ۱۹۳۸ء

کی اشاعت میں ایک طویل مقالہؔ کے دوران لکھا:۔

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔

اس کے بعد دو تین سال میں ان کی پوزیشن قدرے مستحکم ہوگئی تو انہوں نے، اگست ۱۹۴۱ء میں خود اپنی پارٹی قائم کرلی جس کا نام "جماعتِ اسلامی" رکھا گیا۔ اس میں جماعت کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ یونہی رسمی نہیں تھا۔ اس کی تہ میں ایک اہم نکتہ پنہاں تھا جس کا انکشاف مودودی (مرحوم) نے اپنے اس مقالہ میں فرمایا جو اس جماعت کے ترجمان، ایشیا کی ۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ

جو لوگ ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین، اور ایک ہی مقصد رکھتے ہوں ان کے لئے ایک جماعت بن جانے کے سوا چارہ نہیں۔ اور ان کا ایک جماعت بن جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ وحدتِ کلمہ کا لازمی نتیجہ اتحاد واجتماع ہے اور افتراق اس جگہ ہوتا ہے جہاں کلمہ متفرق ہو۔

یعنی مودودی (مرحوم) نے پہلے کہا تھا کہ مسلمان خود ایک جمعیت ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کلمہ کے اشتراک کی بنا پر ہی ایک جمعیت تھے جس کے اندر جماعتیں بنانا خلافِ اسلام تھا۔ اب اس جمعیت کے اندر سے ایسے لوگوں کو چنا گیا تھا جن کا کلمہ مشترک تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ بہرحال دیگر مسلمانوں کے کلمہ سے الگ ہوگا جبھی تو یہ ایک الگ پارٹی بنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مودودی (مرحوم) نے اپنی جماعت کے ارکین کو متنبہ کردیا تھا کہ

جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش بھی نہ کی جائے (ایضاً)

ملک میں سیاسی تقاضوں کے ساتھ ساتھ، ان حضرات کے نزدیک سیاسی پارٹیوں کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ جب (۱۹۷۸ء میں) ملک میں یہ آواز ابھری کہ سیاسی پارٹیوں کو معطل یا محدود کردیا جائے تو اس کے خلاف سب سے پہلے انہی حضرات کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ چنانچہ (اس وقت) کالعدم جماعت اسلامی کے امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے فرمایا کہ

ملک میں سیاسی جماعتوں کو معطل کرنے اور محدود کرنے کی تجویز ملک کے ساتھ بے انصافی ہے..... اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو چند ماہ کے دوران سب کچھ چوپٹ ہوجائے گا۔

(نوائے وقت۔ ۱۱ جون ۱۹۷۸ء)

آپ غور فرمائیے کہ امت میں پارٹیوں کو ممنوع قرار دینا بھی اسلام تھا، اور اس کے بعد یہ بھی اسلام!

ؔ یہ مقالہ بعد میں مودودی (مرحوم) کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اوّل" میں شامل کردیا گیا تھا۔

پارلیمان میں پارٹیاں

اور آگے بڑھیئے۔ سوال پیدا ہوا کہ پارلیمان میں الگ الگ پارٹیاں بنانا جائز ہوگا یا نہیں۔ مودودی (مرحوم) نے فرمایا کہ

مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر سے بہتر نمائندے منتخب کرانے کے لئے انتخابات میں حصّہ لے سکتی ہیں۔ مگر منتخب ہوجانے کے بعد ارکانِ مجلس قانون ساز کو پارٹیوں کی وفاداری سے آزاد ہوکر اپنے ضمیر و ایمان کے مطابق اپنے فیصلے انجام دینے چاہئیں۔ (دستوری تجاویز۔ ص ۱۴)

اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

جماعتِ اسلامی نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی پارلیمانی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہر اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی قائم کرنے کی ہدایت کی جائے۔
(کوہستان ۔ ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء)

اور ۱۹۷۰ء میں فیصلہ کیا گیا کہ

صوبائی اور نیشنل اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی کی پارلیمانی پارٹی حسب ذیل اصول پر کام کرے گی۔
(جماعتِ اسلامی کا منشور بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۰ء)

وہ بھی اسلام ——— یہ بھی اسلام!

انتخابات

پارلیمان کا ذکر آیا تو کچھ قصّہ انتخابات کا بھی سن لیجئے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی اِدھر آگئی تو وہ کمزور سی جماعت تھی۔ دوسرے، وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں مطعون بھی تھی۔ ان حالات میں ۵۱ ۔ ۱۹۵۰ء کے انتخابات کا زمانہ آیا تو مودودی (مرحوم) نے کہا :-

اب ہم کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں، بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام النّاس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار

بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(بحوالہ جماعت اسلامی کی انتخابی "جدوجہد" مطبوعہ ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مودودی (مرحوم) کے نزدیک یہ فیصلہ کس قدر اسلام کی اساسات میں سے تھا اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر اسلام کی یہی تعلیم ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کے اُمّیدوار کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے فرمایا:-

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

یعنی مودودی (مرحوم) کے نزدیک اسلام کا یہ اصول اس قدر محکم تھا کہ اس کے خلاف حضرت علیؓ کے فیصلے کو بھی ان کی لغزش قرار دیا گیا۔

چند سال بعد، ۱۹۵۸ء کے انتخابات کے زمانہ میں، جماعتِ اسلامی کی پوزیشن قدرے بہتر ہو گئی اس لئے اس سلسلے میں مودودی (مرحوم) نے اپنے سابقہ فیصلہ میں حسبِ ذیل ترمیم فرمائی:-

جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۰-۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لئے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخابات میں پورے ملک کی ہر نشست کے لئے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں امیدوار کھڑے کر سکیں ...... اس بنا پر ہم نے سابقہ پالیسی میں یہ تغیر کر دیا ہے کہ ہم خود تو امیدوار بن کر کھڑے ہونے سے بدستور مجتنب رہیں گے لیکن فاسد عناصر کے شر کو رفع کرنے اور ان کے مقابلے میں نسبتاً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی انہیں ووٹ دیں گے بھی اور دلوائیں گے بھی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء ص ۱۲۳)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرما دیا کہ

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور

اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی (مرحوم) کی پہلی پالیسی بھی، ان کے بیان کے مطابق، عین مطابقِ اسلام تھی، اور اب یہ تبدیل شدہ پالیسی بھی عین مطابقِ اسلام، یہ الگ بات تھی کہ یہ چیز جماعتِ اسلامی کے بہت سے اکابرین کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے کہ اس قسم کی اصول شکنی تو کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

اس کے بعد (کالعدم) جماعتِ اسلامی نے ہر انتخاب میں حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے سلسلہ میں اس "اسلامی خدمت" کے لئے، جماعت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے چندے کی بھی اپیل کی۔ انہوں نے کہا:-

حالیہ انتخاباتِ عام میں قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی ملک کی دوسری حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ متحد ہو کر اپنے حصے کے نمائندے کھڑے کر رہی ہے۔ لیکن جماعت اور اس کے کارکنوں سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ جماعت کے پاس مخلص، محنتی، دیانتدار اور فرض شناس افراد اور کارکن تو بہت موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر متوسط اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے انتخابات کے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں ایک ایک حلقۂ انتخاب کے لئے اخراجات کا جو اندازہ قانون میں رکھا گیا ہے اور جو سرکاری پارٹی اور عام امیدواروں کے اخراجات کا شائد چند فی صدی ہوگا۔ اس کے حساب سے بھی لاکھوں روپے کی ضرورت ہے اس لئے میں ملک کے تمام باشندوں سے خواہ وہ پاکستان کے اندر رہیں یا باہر، اپیل کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اور جلد از جلد جماعت کی مالی معاونت فرمائیں اور جماعت اور اس کی حلیف حزبِ اختلاف کی جماعتوں یعنی پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدواروں کو اپنا ووٹ دے اور دلوا کر کامیاب بنانے کی بھی پوری کوشش کریں۔ (ایشیا۔ بابت ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء۔ صفحہ اول)

ان انتخابات میں، اقامتِ دین کی اس مدعی جماعت نے کیا کچھ کیا، اس کے متعلق، اس جماعت کے ایک نہایت ذمہ دار (سابقہ) رکن (سید وصی مظہر ندوی) کا وہ خط قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ جو انہوں نے ماہنامہ میثاق کی محرم الحرام۔ صفر ۱۴۰۳ھ کی اشاعت میں شائع کیا تھا۔ یہ خط ہم نے طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا لیکن موضوع کی نسبت سے اسے دوبارہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے:-

پھر کارکنوں کو بھی انتخابی ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی چلی گئی۔ ابتداءً تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کی حیثیت سے ان کو ہر غلط طریقہ اختیار کرنے میں جھجک محسوس ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ "نظریہ ضرورت" و "نیت کی صحت" اور تحریک کے اندر اور باہر کے مخالفوں کو خاموش کر دینے کی غرض سے ایک دفعہ کامیاب ہو کر دکھا دینے کے جذبہ نے ہر غلط طریقہ کو جائز کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

پنجاب کے پہلے صوبائی انتخابات میں اصول پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص خود رضاکارانہ جعلی ووٹ ڈالنا چاہتا تو کارکن اس کو سختی کے ساتھ منع کرتے لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جعلی ووٹ رہنماؤں کے علم میں ڈالے گئے، مگر انہوں نے اس قسم کی حرکتیں کرنے والوں کو نہ صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ کسی درجہ میں اُن کی طرف سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ پھر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نوبت اس حد تک جا پہنچی کہ ذمہ دار

ارکان نے سیاہی مٹانے والے لوشن ایجاد کرکے ان کو استعمال کیا اور تحریک کے علم میں ہونے کے باوجود ان لوگوں کا کوئی احتساب نہ کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نعرے، تقریریں، الزامات، حرکات وسکنات غرض ہر پہلو سے تحریک اسلامی کے کارکن ماشاء اللہ ایک دنیادار سیاسی پارٹی کی سطح پر آچکے تھے۔ بیگمات کے خلاف غیر مہذب نعرے، بھنگڑا ناچ، بے پردہ خواتین کے جلوسوں کی قیادت، توڑ پھوڑ کی اسکیموں میں رہنمائی، جلسوں اور جلوسوں کی ہماہمی میں نمازوں سے بے نیازی، غرض یہ کہ یہ سب کچھ جائز بلکہ مستحسن ٹھہرالیا گیا۔

ویٹو کا حق

سوال پیدا ہوا کہ ملک کا نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ پارلیمانی نظام میں فیصلے اکثریت کے ہوتے ہیں۔ صدارتی نظام میں پریذیڈنٹ کو ویٹو کا حق حاصل ہوتا ہے۔ مودودی (مرحوم) نے اپنی جماعت کے سلسلہ میں اسلام کی رو سے فرمایا تھا کہ

> جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ وسفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام، تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (پمفلٹ۔ اسلام کا نظریہ سیاسی ص ۴۵-۴۴)

دوسرے مقام پر کہا:۔

> امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو کا استعمال کرسکے گا۔ (ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۳)

ایک اور جگہ اسے ان الفاظ میں دہرایا:۔

> امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔ (اردو دستوری خاکے ص ۲۸)

اس کے بعد، صدر ایوب کے زمانہ میں، نظام حکومت صدارتی قرار پایا تو مودودی (مرحوم) نے اس کے خلاف حسب ذیل فتویٰ صادر فرمادیا:۔

> جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے لیا جائے یا جسے ان کی جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت

کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

عورت اور سیاست

(مرحوم) صدر ایوب کے زمانے میں جب محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئی تھیں تو اس سوال نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اسلام کی رو سے عورت کو اس طرح سیاست میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ مودودی (مرحوم) اس سے پہلے اس سوال کا جواب بدیں الفاظ دے چکے تھے۔

> مجلسِ دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ (دستوری تجاویز)

ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں تحریر فرمایا:۔

> کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ گھر میں تو عورت کو قوّام نہ بنائے گا لیکن کئی لاکھ گھروں کے مجموعہ (یعنی مملکت) پر اس کو قوّام بنا دے گا۔

لیکن مودودی (مرحوم) اور جماعتِ اسلامی نے محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی تائید کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب مودودی (مرحوم) پر یہ اعتراض کیا گیا تو انہوں نے:

> چیلنج کیا کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہِ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔ (روزنامہ مشرق۔ مورخہ ۱۲ ۱/۶۴)

پیشۂ وکالت

مودودی (مرحوم) نے تقسیمِ ہند سے قبل، پیشۂ وکالت کے متعلق ایک وکیل کے استفسار کے جواب میں، اسلام کا نقطۂ نظر یوں بیان فرمایا تھا:۔

> اپنے پیشے کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابقِ شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچکر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچکر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے

> مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہوگی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم، اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔
>
> (ترجمان القرآن - جنوری فروری ۱۹۴۴ء صفحہ ۸۳ تا ۸۶)

انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ "وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے"۔ (ایضاً)

اس کے بعد جب یہاں آ کر دیکھا گیا کہ وکلاء حضرات کی تائید ناگزیر ہے تو میاں طفیل محمد صاحب نے ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو ساہیوال بار کونسل میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> آپ کا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو ملک و قوم میں اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک اونچا مقام رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی لیڈر شپ ہمیشہ ماہرینِ قانون کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام یوسف (رحمہ اللہ تعالیٰ اجمعین) سب ماہر قانون ہی تو تھے اور مسلم معاشرے کے نباض کی حیثیت سے ان کی راہنمائی پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ آج آپ بھی اسی مسند پر بیٹھے ہوئے قوم کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ آپ کے کاندھوں پر ایک زبردست ذمہ داری کا بوجھ ہے جسے انتھک لگن اور مسلسل کاوش سے ہی آپ اٹھا سکتے ہیں۔

کہا جائے گا کہ مودودی (مرحوم) نے وہ کچھ "باطل نظام" میں پیشۂ وکالت کے متعلق کہا تھا اور میاں صاحب نے یہ کچھ پاکستان میں کیا ہے جہاں "اسلامی نظام" رائج ہے۔ سو گزارش ہے کہ میاں صاحب (۱۹۶۷ء میں تو ایک طرف) اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہے۔ انہوں نے ابھی اگلے دنوں کہا ہے کہ پاکستان تو ایک طرف، دنیا کے کسی ملک میں بھی اسلامی نظام نافذ نہیں۔ (اب اس میں سعودی عرب کی استثناء کر لی گئی ہے)

معاشی نظام

اس وقت دنیا میں معاشی نظام کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقوام عالم بالعموم اور مسلمان بالخصوص یہ معلوم کرنے کے لئے بیحد مشوش ہیں کہ اسلام کا اس باب میں کیا مسلک ہے۔ طلوع اسلام اس موضوع پر گزشتہ پینتیس سال سے (قریب قریب متواتر) لکھتا چلا آ رہا ہے۔ اس ضمن میں مودودی (مرحوم) کا مسلک بھی متعدد بار ان صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ہم اس تکرار کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں لیکن موضوع زیر نظر کا تقاضا ہے کہ (کم از کم) اس کا ملخص دہرا دیا جائے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "مسئلہ ملکیت" میں لکھا تھا کہ

۱۔ زمین کی ملکیت کے رقبہ کو محدود کرنا۔ اور ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کا تخیل بنیادی طور پر جو اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ اور

۲۔ اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کرسکا۔
۱۹۷۰ء کے الیکشن کے سلسلہ میں (کالعدم) پیپلز پارٹی نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی اور صنعتی ادارے اور دیگر اسی قسم کی تنصیبات بھی قوم کی تحویل میں ہونی چاہئیں۔ اس نعرہ میں اس قدر کشش تھی کہ لوگ جوق در جوق اس پارٹی کی طرف جانے شروع ہو گئے۔ جب مودودی (مرحوم) نے دیکھا کہ اس طرح ان کی جماعت کو انتخابات میں شکست ہو جائے گی تو انہوں نے رنگ بدلا اور اپنے "انتخابی منشور" میں لکھا:۔

قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔

صنعتوں کے قومیانے کے متعلق کہا:۔

ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطورِ اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے، انہیں قومی ملکیت میں بمعاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز نہیں سمجھتے۔

یعنی "جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کرسکا تھا" وہ اب اسلام کی رُو سے ناجائز نہیں رہا۔

یہ ہیں چند ایک جھلکیاں اُس "ضرورت کے مطابق بدلنے والے اسلام" کی جسے یہ حضرات اقامتِ دین کے نام سے پاکستان میں پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اگر اسلام نافذ کرنے کے اختیارات اس قسم کی جماعت کے ہاتھ میں آجائیں تو یہاں کس قسم کا اسلام نافذ ہوگا؟ جب قرآن نے کہا کہ یہ ہیں وہ احکام جن کی اطاعت مقصود ہے اور ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، تو اس سے انسان کو کس قدر اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ کوئی کہہ ہی نہ سکے کہ کل کو کونسا اسلام نافذ ہو جائے گا تو اس سے انسان کے امن و اطمینان کی کیفیت کیا ہوگی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نظریہ ضرورت کے تحت بدلنے والے "اسلام" کا اثر انسان کے کردار پر بھی پڑتا ہے اس کی ایک مثال اس جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے اس اجلاس میں سامنے آئی تھی جو ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوا تھا اور جس کے نتیجہ میں جماعت کے متعدد اکابرین جماعت سے الگ ہو گئے تھے۔ ان میں (فیصل آباد کے) حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب بھی تھے جنہوں نے اس کی روئداد اپنے ہفتہ وار اخبار المنبر کی ۷ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع کی تھی۔ آپ اسے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۹۵۶ء کی معرکۃ الآرا شوریٰ جماعتِ اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ زیرِ بحث آئی اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی (مرحوم) نے تحریکِ اسلامی کے محرکِ اوّل اور جماعتِ اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں قتل گاہیں ہیں اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے۔

چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متاثر ہو کر جماعتِ اسلامی کے متعدد کارکنوں اور

ارکان نے اپنی اولاد کو مروّجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنادیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیر جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا۔ یہی اقدام ناقابلِ تصوّر تھا مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سُنا کہ مولانا مودودی (مرحوم) نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرادیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اُڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

(ہفتہ وار المنبر۔ فیصل آباد ۷۔۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ

میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا۔ اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں، مَیں بعض لوگوں کے تصوّر کے مطابق داعی، کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔ (ایضاً)

اسی اخبار میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ حکیم صاحب سے ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ

مجلسِ شوریٰ میں مودودی (مرحوم) کے اس جواب پر اراکینِ مجلس کا ردِّ عمل کیا تھا۔ وہ مودودی صاحب کے اس جواب کے خلاف اٹھ کیوں نہ کھڑے ہوئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حضرات مودودی صاحب کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔ اُس وقت اراکینِ جماعت کی کل تعداد تیرہ سو تھی، اور اُن میں ایک سو بیس ارکان مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ یعنی ہر گیارھواں رُکن جماعت سے تنخواہ پاتا تھا۔

اس واقعہ کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کے سامنے اسلام کا جس قسم کا تصوّر ہو، اسی قسم کا اس کا کردار ہو جاتا ہے۔ نظریۂ ضرورت کے تحت، ہر مصلحت کے مطابق بدل جانے والے "اسلام" کا انسانی سیرت و کردار پر اسی قسم کا اثر مرتّب ہو گا۔ اس قسم کے فرمودات کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے"۔ یا مصلحت کے تحت "اصول بھی بلا تکلّف توڑے جا سکتے ہیں" اسی اسلام کے شاخسانے ہیں جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ مودودی (مرحوم) نے جو کچھ کہا ہے اس کے لئے کسی سند (اتھارٹی) پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس لئے کہ میاں طفیل محمد صاحب کے بیان کی رُو سے:۔

مولانا مودودی (مرحوم) اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے۔ اور سند ہیں۔ (قاصد۔ کشمیر نمبر۔ بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ بابت مئی۔ جون ۱۹۵۵ء)

جو اسلام ہر مصلحت کے تابع بدلتا رہے، اور اس کی سند، اس اسلام کے پیش کرنے والے کی اپنی ہستی ہو، اس کے جو نتائج مرتب ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ اسلام کے نام پر، اس سے سخت آمریت کوئی اور ہو نہیں سکتی، بالخصوص جب اس اسلام سے اختلاف، ارتداد قرار دیا جائے، اور اس کی سزا (مودودی مرحوم کے فیصلہ کی رو سے)۔

حقائق و عبر

(۱) تحریک اسلامی کا نیا منشور

جماعت اسلامی جو سیاسی جماعتوں پر پابندی لگنے کے بعد تحریک اسلامی کے نام سے کام کر رہی ہے۔ اس نے اپنے ترجمان ماہنامہ ترجمان القرآن کی جولائی ۸۵ء کی اشاعت میں اپنے نئے منشور کے خدوخال دیئے ہیں۔ اس میں زرعی زمین کی حد مقرر کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجویز پیش کی گئی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اسلامی حلقوں کی طرف سے قانون انسداد جاگیرداری آنا چاہیئے جس کے لئے ہمارے پچھلے منشور میں ایک واضح فیصلہ موجود ہے۔ خلاصہ یہ کہ جاگیرداریوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو ناجائز طور پر دی گئیں۔ دوسری وہ جو بعض خدمات کے لئے دی گئیں۔ مگر وہ حق الخدمت کئی گنا زیادہ ادا کر چکی ہیں۔ ان دونوں قسموں کی (یعنی تمام جاگیرداریوں) کو ختم کر دینا چاہیئے۔ صرف ایسا گذارہ یونٹ مستثنیٰ رکھا جا سکتا ہے جو زرعی رقبے، چارے کی کاشت کے رقبے، مرغی خانے، مچھلی فارم، پولٹری فارم، ڈیری فارم، چراگاہ، شکارگاہ، مویشی خانے، اپنی اور مزارعین اور ملازمین کی رہائش گاہوں، ٹیوب ویلوں یا ورکشاپ کے رقبوں سمیت زیادہ سے زیادہ (مثلاً) یک صد ایکڑ آبپاشی اور ڈیڑھ صد ایکڑ بارانی رقبے پر مشتمل ہو۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن بابت جولائی ۸۵ صفحہ ۴۹/۲۷۳)

جماعت اسلامی کا سابقہ منشور قومی اتحاد کا منشور ہی تھا، جس پر اتحاد پر شامل ہونے والی ساری جماعتوں بشمول جماعت اسلامی۔ نے دستخط کئے تھے، اس میں زرعی زمین کی حد بندی کی بجائے غالباً یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ شریعت اسلامی میں زمین کی بٹائی ناجائز ہے اس لئے زمین اسی کی ہو گی جو اس میں ہل چلائے گا۔ (قومی اتحاد کا منشور صفحہ ۱۶) اسی مناسبت سے قومی اتحاد نے اپنا انتخابی نشان ہل مقرر کیا تھا۔

اس منشور کی اشاعت چونکہ وسیع پیمانے پر ہوئی تھی، اس لئے زمین کے مالکوں کی جانب سے جماعت اسلامی پر اعتراض کئے گئے کہ اس کے امیر مودودی صاحب تو زمین کی بے حد و حساب ملکیت اور بٹائی کو جائز قرار دیتے تھے اور اس کی تائید میں انہوں نے مودودی صاحب

کا یہ فیصلہ نقل کیا :-

اسلام اس تخیل سے قطعی نا آشنا ہے کہ زرعی جائیداد کی ملکیت، دوسرے اقسام کی املاک اور جائیدادوں سے الگ نوعیت رکھتی ہے، جن پر ان سب کے برعکس، اس کی جائز ملکیت کے لئے رقبہ کے لحاظ سے کوئی حد مقرر کر دی جائے یا یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ہر شخص اور خاندان کے قبضے میں صرف اتنی زمین رہنی چاہیئے جس میں وہ خود کاشت کر سکے۔ یا خود کاشتی سے زائد ملکیت کا حق دینے کے بعد، دوسری ایسی پابندیاں لگا دی جاتیں جن کی وجہ سے یہ حق بے معنی ہو کر رہ جائے، ایسی حد بندیوں کے لئے فی الحقیقت کتاب وسنت میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین از جناب مودودی صاحب صفحہ ۹۴)

جماعت کے کسی ذمہ دار آدمی نے اس اعتراض کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ تاہم ان کے کچھ دوسرے اہلِ علم حضرات نے قومی اتحاد کے اس منشور کو کہ جس پر جماعتِ اسلامی نے دستخط کئے تھے، کی مدافعت کرتے ہوئے اخبارات میں بیان دیئے کہ قومی اتحاد کے منشور میں زمینداری نظام ختم کر کے زمین کو خود کاشت تک محدود کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے زمین کی بٹائی کے طریقے کو اپنی زبانِ مبارک سے سود قرار دیا تھا۔ اور ہمارے امام ابوحنیفہ نے بھی اسے حرام قرار دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حیرت کی بات ہے کہ اب ان کی جانب سے زرعی اراضی کی پھر حد بندی کی تجاویز پیش کی جا رہی ہیں، جو نہ صرف یہ مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ بلکہ قومی اتحاد کے منشور میں جو کچھ انہوں نے تسلیم کیا تھا اس کے بھی الٹ ہے۔ کتاب وسنّت کی یہ کیسی تعلیم ہے کہ جب چاہا اس کے حوالے سے، کسی چیز کو حرام قرار دے دیا اور جب چاہا اسی چیز کو حلال سمجھ لیا۔ کیا اسلامی نظام کے علمبرداروں کو اتنا بڑا تضاد نظر نہیں آتا جس کے حلال وحرام ہونے کا اثر ملک کے کروڑوں انسانوں پر پڑتا ہے۔

(۲) مولانا تھانوی اور ان کا مرید

ایک مرتبہ مولانا تھانوی کے کسی مرید نے اپنا خواب لکھ بھیجا وہ یہ ہے۔ میں نے رات خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمہ تشہد صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر بار ہوتا یہ ہے کہ لا اِلٰہ اِلّا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی اور وہ اثر نا طاقتی

بھی بدستور تھا۔ لیکن حالت بیداری میں حضور کا (تھانوی کا) ہی خیال تھا۔ لیکن حالت بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جائے۔ بایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی کہتا ہوں "اللھم صل علی سیدنا ونبینا و مولانا اشرف علی" حالانکہ اب بیدار ہوں خواب نہیں لیکن بے اختیار ہوں۔ مجبور ہوں۔ زبان اپنے قابو میں نہیں ہے۔

(مرید کا یہ خط دیکھ کر مولانا تھانویؒ نے اسے یہ جواب لکھ بھیجا ہے)

اس واقعہ میں تسلی تھی کہ جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو۔ وہ بعونہٖ تعالیٰ متبع سنت ہے۔" (رسالہ الامداد ۱۳۳۵ھ صفحہ ۳۴)

اس اقتباس پر غور فرمائیں کہ مولانا تھانویؒ نے مرید کی زبان سے نکلے ہوئے کفر "صریح" کے جملے کا کس نشاط و سرور طبع کے ساتھ تحسین آمیز انداز میں حوصلہ افزا جواب دیا ہے۔ مولانا تھانویؒ کا دینی معاملات میں اغماض امتِ مسلمہ کے حق میں کس قدر زہر قاتل ہے اس پر کچھ کہنے کے بجائے انہی کے آدمی مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ[1]۔ رکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا تبصرہ درج ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مولانا تھانویؒ میں اپنے معاملات کی تاویل اغماض و مسامحت کی خو تھی۔ ظاہر ہے اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ تھا کہ یہ کلمہ کفر ہے شیطان کا فریب ہے اور نفس کا دھوکہ ہے تم فوراً توبہ کرو اور استغفار کرو۔ لیکن مولانا تھانویؒ صرف یہ فرما کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ تم کو غایت مجھ سے محبت ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

(برہان فروری ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۰۰)

اس تبصرہ کے بعد اس تشنۂ تکمیل تبصرہ میں اپنی طرف سے اتنا اور اضافہ کیے دیتا ہوں۔

اس خواب کا واقعہ دراصل مرشد و مرید کا سمجھا بوجھا منصوبہ اور دونوں ہی کی منظم سازش کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ جھوٹا عذر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ مرید کی زبان بے قابو ہو گئی تھی اور بے اختیاری میں، کلمہ کفر نکل گیا تھا۔ تو تعجب اس پر ہے

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ کو کراچی میں فوت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نہ صرف قدیم و جدید علوم سے بہرہ ور تھے بلکہ "دارالعلوم دیوبند" کے فاضل ہونے کے باوجود فقہی جمود سے پاک تھے تین طلاقوں کے مسئلہ میں مرحوم نے فقہ حنفی کو چھوڑ کر قرآن و حدیث سے براہ راست تمسک کیا ہے حق گوئی کے ضمن میں اسی مضمون میں شائع ہونے والی ان کی تحریر کا یہی اقتباس کافی ہوگا۔ مرحوم نے ۴۷ برس تک "برہان" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور ان کے اداریے پڑھنے

کہ پیر و مرشد تو ہوش میں تھے اور ان کا قلم اختیار میں تھا۔ تو پھر مرید کو سرزنش کرنے کے بجائے حوصلہ افزا جواب کیوں لکھ بھیجا۔

(بحوالہ ہفت روزہ اہلِ حدیث ۲۶ جولائی ۱۹۸۵ء)

۳۔ بزرگوں پر بہتان

انوارِ صوفیہ مرتبہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں مرقوم ہے:۔

۱۔ قطب الاقطاب غوثِ اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ میں پچیس سال تک ترکِ دنیا کی خاطر عراق کے جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔" بتایئے! قرآن کریم میں کہاں ویرانوں میں مارے مارے پھرنے کا حکم دیا گیا ہے۔؟)

۲۔ پندرہ سال تک نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرتا رہا کہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ایک ہاتھ سے دیوار کی کھونٹی پکڑ کر قرآن کی تلاوت کا آغاز کرتا اور صبح ہوتے تک ختم کر دیتا۔ تین سے لے کر چالیس دن گزر جاتے کہ خورد و نوش اور راحت و خواب سے محروم رہتا۔ (کیا قرآن کریم میں کہیں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تلاوت کا حکم دیا گیا ہے؟) العجب۔

۳۔ گیارہ سال تک برج بغداد میں جس کو میرے طویل قیام کی وجہ سے برج عجمی کہتے ہیں، یادِ حق میں مشغول رہا۔ اس دوران میں خدا سے عہد کرتا رہتا کہ جب تک غیب سے کھانے کو نہ ملے گا۔ ہرگز کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ اس حالت میں کافی عرصہ گزر جاتا۔

(انوارِ صوفیہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اردو ترجمہ محمد طفیل ایم۔ اے صفحہ ۳۵)

۴۔ اہلِ حدیث اور تبلیغی جماعت

جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "اہلِ حدیث" لاہور نے اپنی ۱۹ جولائی کی اشاعت میں "تبلیغ ضروری مگر ....." کے زیرِ عنوان تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

آج تبلیغ کے لئے نہ تفقہ فی الدین کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ حکمت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ جبکہ یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ پر عمل کا دوسرا نام ہے۔

اسی تفقہ فی الدین اور اسی حکمت کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ تبلیغ کا اہل بننے کے لئے صرف ایک "چلہ" اور تبلیغی نصاب پڑھنے کی اہلیت ہی کافی سمجھ لی گئی ہے اور پھر ایک "فوج ظفر موج" کی تیاری ضروری سمجھ لی گئی ہے جو جیسے چاہے جدھر چاہے اور جہاں

چاہے گھیر کر رٹا رٹایا ___ لیکچر جھاڑ دینے کو ہی ___ اس فرض کی ادائیگی کا ہی نہیں بلکہ اپنی نجات کا ذریعہ بھی سمجھتی ہے۔ مگر مجال ہے کہ کسی مبلغ کو۔ انفرادی اصلاح، اپنے گھر کی اصلاح، اپنے پڑوسیوں کی اصلاح اور اپنے محلہ و شہر کی اصلاح کا خیال بھی آئے اس لئے کہ دوسروں کی اصلاح کرنے والوں کی خود اصلاح طلبی۔ اپنوں کے سامنے ہوتی ہے!

اب تو ایک نئی بدعت بھی شروع ہوئی ہے۔ عورتیں بلکہ نوجوان لڑکیاں غول در غول اپنے ہی نہیں دیگر محلوں میں بلکہ دیگر شہروں میں بھی تبلیغ کے لئے جاتی ہیں مگر ان کے گھروں میں جھانک کر دیکھئے اسلامیت نہیں اسلامیت سے بغاوت نظر آئے گی؟!

یہ بجا کہ تبلیغ کی اوّلین بنیاد یا صلاحیت تقویٰ کا انتہائی معیار نہیں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے اسے جو خامی نظر آتی ہے اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے لیکن جو انسان بصیرت ہی نہیں بصارت سے بھی محروم ہو، قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی احادیث سے معمولی واقف بھی نہ ہو ___ وہ بھی غلط انداز میں تبلیغ شروع کر دے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے تقاضے کیسے پورے ہوں گے۔ مسلمان عورتیں خاص طور پر مسلمان نوجوان لڑکیاں بی محرم وغیرہ کے بغیر "تبلیغی سفر" شروع کر دیں تو کیسی تبلیغ اور اس کے کیسے نتائج برآمد ہوں گے۔ ..... فاعتبروا یا اولی الابصار

۵۔ نہ وہ عشق میں رہی گرمیاں

تحریک اسلامی (سابقہ جماعت اسلامی) کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا، قومی اسمبلی کے حالیہ بجٹ اجلاس کے دوران، مندرجہ بالا عنوان کے تحت علماء کی کارکردگی کا جائزہ ان الفاظ میں لیتا ہے۔

قومی اسمبلی کی کارروائی پوری قوم کی دلچسپی کا مرکز بنی رہی خواتین کا عمل اس پہلو سے داد طلب ہے کہ ان کی نگاہ اپنے موقف و مقصد سے نہیں ہٹی۔ لیکن افسوس کہ قومی اسمبلی کا جید علماء پر مشتمل شریعت گروپ اپنے مقاصد کی پاسبانی نہ کر سکا۔ مغرب زدہ خواتین حدیث رسولؐ پر واک آؤٹ کر کے اپنی ناراضگی ریکارڈ کرا گئیں۔ لیکن بجٹ میں رکھی گئی سودی اسکیموں اور خاندانی منصوبہ بندی علماء کرام کے ضمیر پر ہلکی سی خراش بھی پیدا نہ کر سکیں۔ بجٹ ان کے بغیر بھی منظور ہو سکتا تھا۔ لیکن احتجاج کا ریکارڈ تو رہنا۔ اس کی منظوری کے لئے ووٹ مانگے گئے تو سب کے ہاتھ بلا استثنیٰ بلند ہو گئے۔ کیا کسی کو قرآن کی یہ وعید یاد نہ آئی کہ اگر سود پر اصرار ہے تو پھر اللہ اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ؟ اسمبلی میں کہا گیا کہ رکن خواتین پردہ کریں، ان کے لئے زیادہ مناسب ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ فقروں کے یہ تبادلے قومی اسمبلی میں بھی ہوتے اور پنجاب اسمبلی میں

بھی۔ لیکن کسی ایک نے بھی حکومت سے یہ سوال کرنے کی جرأت نہ کی کہ عورتوں کی اتنی بڑی تعداد اسمبلیوں کے لئے رکھی کیوں گئی؟ انصاری کمیشن میں سفارش کی گئی تھی کہ صرف معمر خواتین ہی کو رکن اسمبلی بننے کی اجازت دی جائے۔ لیکن نفاذِ اسلام کے اس دور میں خواتین کو بھی قلمدانِ وزارت دے دیئے گئے۔ حالانکہ اس کی جرأت سابق لادین عوامی میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ (بحوالہ ہفت روزہ ایشیاء بابت ۷ جولائی ۸۵ء)

۶۔ جماعت اسلامی کی سیاست

ہفت روزہ استقلال لاہور اپنی ۲۱ جولائی کی اشاعت میں "غلط باتیں" کے عنوان سے جماعتِ اسلامی کی سیاست کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ہمارے سیاسی رہنما جذبات سے مغلوب ہو کر بسا اوقات ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔ جنہیں عملی جامہ پہنانے کی انہیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ جماعتِ اسلامی کے رہنما اور کارکن یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ اگر قومی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران مارشل لاء نہ ہٹایا گیا تو ہم اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ بجٹ سیشن ختم ہو چکا ہے اور مارشل لاء بدستور موجود ہے مگر جماعتِ اسلامی کے ارکان بدستور اسمبلی کے رکن ہیں۔ اسی طرح پیر صاحب پگاڑا نے فرمایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ میں دھماکہ کریں گے لیکن قومی اسمبلی کے بعد سینٹ کا اجلاس بھی ملتوی ہو گیا اور پیر صاحب نے کوئی دھماکہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

جماعتِ اسلامی کے قائد میاں طفیل محمد نے اب ایک تقریر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے صدر ضیاء الحق کو غیر جماعتی انتخابات سے روکا تھا۔ لیکن ریفرنڈم کرانے کی تجویز ہماری تھی۔ میاں صاحب نے اپنی تقریر میں یہ نہیں بتایا کہ آیا ان کی طرف سے ریفرنڈم کرانے کی تجویز میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ریفرنڈم میں کامیابی کی صورت میں صدر مملکت خود بخود پانچ سال کے لئے صدر منتخب ہوں گے اب میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم ضرورت پڑنے پر حکومت کے خلاف پُرامن تحریک چلائیں گے۔ کیا جمہوریت بحال کرانے کے لئے میاں صاحب کوئی پُرامن تحریک چلائیں گے؟

حکومت کے خلاف جماعتِ اسلامی کی یہ تحریک بھی اسمبلیوں سے مستعفی ہونے کی دھمکی سے مختلف نہ ہو گی۔

دین کی باتیں

ہم سامعین درس بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے مشفق جناب پرویز صاحب مرحوم کا ہفتہ وار درسِ قرآن کریم علم و بصیرت کا ایک ایسا سمندر تھا جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ انہی حضرات کو ہو سکتا تھا جنہیں اس میں شریک ہونے کا موقع ملتا رہا۔ مجھے اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ میں اس سے مسلسل بہرہ یاب ہوتی رہی۔ یوں تو اس درس کی ایک ایک بات دل میں اترتی محسوس ہوتی لیکن بعض نکات کی اہمیت سوا تھی۔ ان کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کے خیال سے میں انہیں ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کرتی رہی۔ پرویز صاحب یعنی اپنے بابا جی حیات تھے تو ہمیں ان سے براہِ راست رہنمائی لینے کے زریں مواقع میسر تھے۔ ان کا سایہ رحمت اٹھ جانے کے بعد ہم ان کے محفوظ فرمودات سے اپنی ذات کی تاریکیاں دُور کر سکتے ہیں اور ان کے پیش کردہ نکات قرآنی پر غور و فکر کر کے اپنی حیات کی راہیں روشن کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ ان نکات میں سے چند کو ان حضرات کے علم میں بھی لایا جائے جو ان درسِ قرآنی میں شریک نہ ہو سکے۔ چونکہ یہ دین کی باتیں ہیں اس لئے اسی عنوان سے ان کو پیش کر رہی ہوں۔

(۱) دین تو شروع سے ایک ہی رہا۔ یہ ایک ہی تھا۔ ایک ہی ہے اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہمیشہ کے لئے ایک ہی رہے گا، دوسرے تمام مذاہب دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ دین اپنی اصلی شکل میں اسلام کے نام سے قرآن مجید کے اندر موجود ہے اور واضح رہے کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔

(۲) دنیا میں فرعونیت چل ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ نہ ہو۔ کوئی فرعون ہامان کے بغیر حکومت نہیں کر سکتا۔

(۳) مومن کا ہر سانس ہر قدم اس کا ہر ارادہ اور ہر عمل اس مقصد کے لئے ہوتا ہے کہ اس سے خدا کی صفت رحمانیت کا دنیا میں ظہور ہو جائے۔ یعنی ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے

(۴) ہر وہ دیدہ ور جو اپنی نگاہوں کو غیروں کے تصورات و خیالات سے پاک کرے اور پھر قرآن کریم کی روشنی سے دنیا کو دیکھے اسے وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جس کا ایک عام نگاہ احاطہ نہیں کر سکتی۔

(۵) جھوٹ کبھی جھوٹ کی شکل میں لوگوں کو فریب نہیں دے سکتا۔ وہ ہمیشہ سچ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ جھوٹ بے نقاب فریب نہیں دے سکتا۔

(۶) ابلیسی نظام دین کی اصطلاحات نہیں بدلتا۔ وہ الفاظ کو زندہ رکھتا ہے لیکن ان کے معانی مسخ کر دیتا ہے۔ وہ رسوم کو قائم رکھتا ہے۔ ان کی روح کھینچ لیتا ہے۔

(۷) اسلامی جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کو عوام کے ذہنوں میں پیوست کیا جائے۔

(۸) تسخیر فطرت مقام آدمیت ہے اور ان قوتوں کو وجۂ تزئینِ انسانیت بنانا فریضۂ مومن ہے آدم کے سامنے ملائکہ جھکتے ہیں لیکن مومن کے سامنے ملائکہ اور ابلیس دونوں جھک جاتے ہیں

(۹) دنیا میں وہی عمل بقائے دوام کا مستحق ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

(۱۰) قرآن کریم کا پروگرام تمام نوع انسان کو امت واحدہ بنانا ہے۔

(۱۱) دیانت کی خاطر دیانت اختیار کرنے والے کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے جواب میں کیا کرتے اور کیا کہتے ہیں۔ صداقت کی خاطر صداقت پر قائم رہنے والے کو یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا؟

(۱۲) دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدار انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے انکار کریں دوسری قوم کے افراد۔

(۱۳) دینداری کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کس قسم کا ہے۔

(۱۴) جہنم اسے آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جو سید ھے راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے یعنی اسے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے۔

(۱۵) ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے قرآن اس استبداد کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

(۱۶) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔

(۱۷) جو کوئی الاسلام کے سوا کوئی اور نظام زندگی چاہتا ہے تو وہ نظام کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور وہ آخرالامر نقصان اٹھائے گا۔

(۱۸) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے ان سب کو تمہارے فائدے کیلئے قانون کی زنجیروں سے مسخر کر رکھا ہے۔

(۱۹) وہی انسانی علم، علم کہلانے کا مستحق ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے اور فکری طور پر استنباط نتائج کرے۔

(۲۰) قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہ کرنے کی وجہ سے انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے۔

(۲۱) جو قوم جس سانس میں جدوجہد (جہاد) سے جی چراتی ہے، اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ جہاد کا ہے۔

(۲۲) جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔

(۲۳) تم سے ہر متاع کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ کیسے حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوئی تھی۔

(۲۴) ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں خالی الذھن ہو کر غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آئے۔

(۲۵) ایک آئینِ خداوندی کی پابندی ہزاروں انسانوں کی غلامی سے چھڑا دیتی ہے لیکن آئین کی یہ پابندی بہ طیب خاطر ہونی چاہیئے۔

(۲۶) قرآن کا مقصد اختلافات کو مٹا کر دین کی وحدت کا قیام ہے اور اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔

(۲۷) اے جماعت مومنین! تم ہمیشہ استقامت سے کام لو۔ نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً استقامت دکھاؤ۔ بلکہ ایک دوسرے کی استقامت کا ذریعہ بن جاؤ۔

(۲۸) جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کر دیا۔ اس نے گویا تمام نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچایا اس نے گویا تمام نوع انسان کو زندگی بخش دی۔

(۲۹) انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو دوسروں کی نشوونما کے لئے دی جائے۔

(۳۰) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کی ضروریات کے لئے کس قدر دے دیا جائے ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب!

(۳۱) خدا کی رزق پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر عائد ہوتی ہے اور جو معاشرہ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دیتا وہ خدا کی حفاظت میں نہیں رہتا۔

(۳۲) جو کام کسی سے مجبوراً کرایا جائے اس میں نیکی اور بدی یا ثواب اور عذاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳۳) قرآن اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظامِ زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے جس میں اخلاقی اقدار معاشرہ میں از خود رواں دواں رہتی ہیں۔

(۳۴) جب ہم قرآن کریم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

(۳۵) اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ہیئت پر پیدا کیا لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو پست ترین سطح پر لے جاتا ہے۔ ایسی پست سطح کہ یہ حیوانات سے بھی نیچے گر جاتا ہے اور یوں بدترین مخلوق بن جاتا ہے۔

(۳۶) سمندر میں ایک تنکے کی طرح زندگی بسر کرنا کہ ہر موج اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے قابلِ فخر زندگی نہیں۔ انسان کو ضبطِ خویش سے پہاڑ کی طرح محکم ہونا چاہیئے، کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے مقام سے نہ ہلا سکے۔

(۳۷) مردِ مومن دنیا کی زیبائش و آرائش سے نفرت نہیں کرتا وہ ان سب سے بہرہ یاب ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کے نصب العین میں حائل ہو کر اس کے لئے زنجیر پا نہیں بن سکتی۔

(۳۸) اختلاف عمل اور وحدتِ امّت دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور فرقہ بندی کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

(۳۹) زندگی کے ہر شعبے میں قانونِ خداوندی کو سامنے رکھنا۔ یہ ہے وہ سب سے بڑی قوّت جس سے مومنین غلط باتوں کے ارتکاب سے بچے رہتے ہیں۔ اس کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔

(۴۰) جب انسانی کوششیں قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہوں تو ان کے فطری نتائج خدا کی تائیدو رحمت کے محسوس پیکر ہوتے ہیں۔

(۴۱) قرآن حکیم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔

(۴۲) اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا یعنی مردہ انسان۔

(۴۳) مسلمان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود تنگی کی حالت میں کیوں نہ رہنا پڑے۔

(۴۴) ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسری کو تھامے اور سنبھالے رکھتی ہے۔

(۴۵) کسی کی کمی کو پورا کرنے کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی کمی پوری ہو گئی۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان کا مفہوم یہی ہے۔

(۴۶) ساری مخلوق ایک کنبہ ہے اور اس کنبے کی پرورش و تربیت کرنے والی حکومت کا نام اسلامی حکومت ہے۔

(۴۷) تم نیکی تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ جب تک تم اپنی متاع عزیز کو دوسروں کے لئے صرف نہ کرو۔

(۴۸) جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے انہوں نے جو کچھ زندگی میں کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے اور جو تم کرو گے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا؟ یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اباؤ و اجداد نے کیا کیا اور کیا کہا تھا۔

(۴۹) تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو تو غلط راستہ پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(۵۰) تم خدائے رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔

(۵۱) اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔
(۵۲) تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔
(۵۳) اپنی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق جو جتنا حاصل کرنا چاہے کر لے۔
(۵۴) موت خود ہمارے اندر سے ابھرتی ہے باہر سے تو اس کے صرف محسوس اسباب پیدا ہوتے ہیں
(۵۵) جو کوئی بھی غلط روش اختیار کرے اور اس کی غلط اندیشیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں تو اسی کو جہنم کی زندگی کہا جائے گا۔
(۵۶) غلط اقدامات کے تخریبی نتائج کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو۔
(۵۷) بچے کو بچپن سے ہی تعلیم ایسی دو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے بُرا کہا ہے اسے بُرا سمجھے اور جس کو اچھا بتایا ہے اسے اچھا سمجھے۔
(۵۸) کفر کی زندگی باطل کے نظام یعنی غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنا ہے۔
(۵۹) مومن کی زندگی حدّت اور برودت کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے۔

اگر قارئین طلوعِ اسلام نے پرویز صاحب کے پیش کردہ نکاتِ قرآنی سے فیضیاب ہونا چاہا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مرتبہ
ثریا عندلیب ۸ جولائی ۱۹۸۵ء

(بقیہ لمعات) صفحہ ۸ سے آگے

آج بھی اگر اسلام کے مالیاتی نظام کو دوبارہ جاری کر دیا جائے تو اس سے حکومت کو اتنی زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے کہ اسے سرمایہ داری نظام کے کسی ٹیکس کو لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس سلسلے میں صرف ایک کام کرنا ہوگا اور وہ غیر حاضر زمینداروں کے طبقے کو ختم کرنا۔ جو اس وقت اس تمام آمدنی کا مالک بنا ہوا ہے جو اسلام کے مالیاتی نظام کی رُو سے اسلامی حکومت کی آمدنی ہے۔

اسلام کے اس مالیاتی نظام کی جھلک دیکھ لینے کے بعد ہماری نوجوان نسل کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اسلام واقعی ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

امتِ مسلمہ کے مسائل کے حل کیلئے ایک عالمی ادارے کی ضرورت

امتِ مسلمہ کو عالمی سطح پر اس وقت جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس نے مسلمان اہلِ فکر کو پریشان کر رکھا ہے۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کے مسلمانوں کو موجودہ کسمپرسی کی حالت سے نکالنے کے لئے ایک عالمی اسلامی ادارے کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی نگرانی کرے۔ عیسائیوں کا ایک ایسا ادارہ عالمی چرچ قائم ہے جو ان کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے اور جہاں بھی انہیں کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ان کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اسی سلسلے میں عالمی ماہنامہ عربیبا، کی تازہ اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۵ء میں مصر کے ایک اہلِ فکر کا مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ قارئین طلوعِ اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، (ادارہ)

فرماتے ہیں کہ آج ہمارے زمانے میں کون سے مسلمان ادارے یا عالمی شخصیات ہیں کہ مسلمانوں کے بارے میں چونکا دینے والی خبروں پر، ان سے فوری کارروائی کی توقع یا درخواست کی جا سکے۔ ایسی ہی چونکا دینے والی ایک خبر حال ہی میں بنگلہ دیش کے صدر مقام ڈھاکہ سے ۱۹ مئی کو ہم تک پہنچی ہے۔

اس خبر کے مطابق، بنگلہ دیش کے بنگالی زبان کے مشہور اخبار 'سنگ باد' نے ایک سرکاری ادارے اسلامی فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل عبدالسبحان کا یہ انکشاف نقل کیا ہے کہ پچھلے پندرہ سالوں میں دس لاکھ مسلمان، اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں تبدیلی مذہب کی سب سے بڑی وجہ عیسائی مشنری اداروں کی جانب سے مہیا کردہ تعلیمی اور طبی سہولتیں ہیں جنہوں نے غریب مسلمانوں میں کشش پیدا کی۔

بنگلہ دیش میں تبدیلی مذہب کا یہ واقعہ کوئی واحد مثال نہیں، بلکہ یہ تو اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے۔ انڈونیشیا میں جو کچھ واقع ہو چکا ہے، اسے بنگلہ دیش کی حکومت سمیت سبھی مسلمان جانتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت صحیح اعداد و شمار میسّر نہیں لیکن اس سب سے بڑے اسلامی ملک جس کی آبادی تیرہ کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہے، کو عیسائی اداروں نے سالوں پہلے عیسائی بنانے کا اعلان کر رکھا ہے اور وہاں پر ہزاروں مشنری ادارے اپنے اس اعلان

کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

افریقی مسلمان اور دنیا کے ہر حصے کے مسلمان پناہ گزین چاہے وہ یوگنڈا میں ہوں یا اریٹیریا لبنان اور افغانستان میں ہوں وہ عیسائی مشنریوں کی ان شاطرانہ کارروائیوں کا خاص ہدف ہیں۔ اگرچہ ان کا اصل نشانہ اسلام ہے جسے وہ صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ دین اسلام، عیسائیت کی نسبت زیادہ معتدل اور فطرت انسانی کے موافق ہے، اس لئے وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف دلائل نہیں دیتے کیونکہ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ مسلمان معاشرہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ بے یار و مددگار غریب اور پناہگزین مسلمانوں اور ان کے بچوں کو مختلف قسم کی سہولتیں میسّر کر کے اور حسب ضرورت انہیں رشوتیں دے کر اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کوششوں پر خطیر رقم خرچ ہوتی ہے جسے امریکہ سمیت ساری عیسائی دنیا سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ بظاہر تو ان بے یار و مددگار لوگوں کی ریلیف کے پردے میں مدد کی جاتی ہے لیکن اس مقصد کے لئے جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ ان بے کس لوگوں کو اپنے دین سے متنفر کر دیتے ہیں اور انجام کار وہ عیسائیت کی گود میں چلے جاتے ہیں۔

کیا اس مجرمانہ المیہ سے عام مسلمانوں کو بری سمجھا جا سکتا ہے؟ ارشادِ نبوی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے مومن کو کبھی معاف نہیں کریں گے، جس کا پڑوسی رات بھر بھوکا رہے۔ بنگلہ دیش میں بھوک یا غربت کی وجہ سے دس لاکھ مسلمانوں کا عیسائی مذہب اختیار کر لینا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اس کے لئے ساری دنیا کے مسلمان اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں!

امیر مسلمان ممالک کا اربوں بلکہ کھربوں ڈالر کا سرمایہ امریکی اور یورپی بینکوں اور سرمایہ کاری کے اداروں میں جمع ہے۔ یہ سرمایہ مسلمان ملکوں میں سرمایہ کاری کے لئے استعمال ہونا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کو غربت سے نجات ملے، ویسے بھی وہاں یورپ اور امریکہ کی نسبت، سرمایہ کاری کے مواقع زیادہ وسیع ہیں اور اس سے ان سرمایہ کاروں کو صرف نفع ہی حاصل نہ ہو گا بلکہ کروڑوں غریب مسلمانوں کی مالی مدد بھی ہو گی۔ جس کی ازحد ضرورت ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں گے۔ غریب مسلمان ممالک کی تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹانا صاحب ثروت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس وقت یہ امیر ممالک، غریب ممالک کے چند بڑے پراجیکٹوں کے لئے ضرور مدد دیتے ہیں، لیکن وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے اور غریب مسلمانوں کو عیسائیت کی یلغار سے بچانے کے لئے کافی نہیں۔ عالمی اسلامی یونیورسٹی جامعۃ الازہر اور رابطہ العالم الاسلامی کو عیسائیوں کی ان سرگرمیوں کا علم ہے اور اس کے تدارک کے لئے وہ ان ملکوں میں اپنے مبلغ بھیج رہی ہیں اور وہاں تبلیغی دفاتر قائم کئے جا رہے ہیں۔ لیکن جب تک مسلمانوں کی اقتصادی حالت سدھارنے کے لئے کام نہیں کیا جائے گا، ایسی تبلیغی مساعی بارآور نہیں ہو سکتیں۔ اس مقصد کو حاصل

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ امیر اسلامی ممالک، غریب مسلمان ممالک کی تعمیر و ترقی کے لیے سرمایہ اکٹھا کریں۔ تاہم یہ سرمایہ مختلف اسلامی ممالک یا افراد کی تحویل میں نہ ہو، بلکہ اس مقصد کے لئے مسلمانوں کا ایک ایسا بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے، جو غریب اسلامی ممالک کی تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی کرتے وقت اسلامی دعوت کے کام کو بھی ملحوظِ خاطر رکھے۔ اس مقصد کے لئے بڑی وسیع بنیادوں پر منصوبہ بندی اور رابطے کی ضرورت ہے جو جہاد فی سبیل اللہ سے کم نہیں۔ اس کے لئے ایک عالمی اسلامی ادارے کی ضرورت ہے۔ جو مختلف ممالک کے مسلمانوں کی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب منصوبہ بندی کرے۔

اس وقت مسلمانوں کا ایک عالمی ادارہ، اسلامی کانفرنس کے نام سے موجود ہے۔ اگر اس ادارے کو فعال بنایا جاسکے تو یہ امتِ مسلمہ کی بہتری کے لئے بہت کام کر سکتا ہے۔ لیکن اس ادارے کو فعال بنانے کے لئے کچھ اہم اقدامات اٹھانے ہونگے۔ سرمایہ داری نظام اور کمیونزم کے کئی کئی ممالک محافظ ہیں۔ اسی طرح عیسائیت اور یہودیت کی محافظ ریاستیں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ سکھ کہ عالمی آبادی کے لحاظ سے جن کی آبادی نہایت قلیل ہے، وہ بھی اپنی علیحدہ مذہبی ریاست بنانے پر تلے ہوئے ہیں، مختصر یہ کہ ہر نظریے اور مذہب کے گرمجوش محافظ موجود ہیں جو ان کے مفاد کی نگرانی کرتے ہیں۔

—— لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے مفاد کی نگرانی کے لئے کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں۔

ہمارے کچھ مسلمان بھائی اس سوال کے جواب میں کہیں گے کہ ہمارا محافظ اور نگہبان اللہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا جو قانون قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں، جو اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک مسلمان سائنسدان ڈاکٹر حسن قطوت جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کر رکھی ہے نے اس موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ لکھا تھا اور مسلمانوں کا عالمی ادارہ نہ ہونے کو ان کی بدبختی قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنے مقالے کو اس تجویز پر ختم کیا تھا کہ اگر مسلمانانِ عالم کے مفاد کی نگرانی کے لئے ویسا ہی کوئی ادارہ ہو جیسا کہ عیسائیوں کا چرچ کا ادارہ ہے، تو امت مسلمہ کے مختلف طبقے، مشکل وقت میں اس کی طرف رجوع کر سکیں گے۔ جیسا کہ اس وقت عیسائی چرچ عملاً کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ اتنے سال گذر جانے کے باوجود اس عمدہ تجویز کا ابھی تک نوٹس نہیں لیا گیا۔ اور ہم بھی ایک دفعہ پھر اسی تجویز کو دہراتے ہیں۔

اہل ثروت مسلمان ممالک اس بارے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ان سے امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں ضرور کوئی عملی قدم اٹھائیں گے اور مسلمانوں کو ہمیشہ یہ پوچھنے کے لئے انتظار نہ کرنا پڑیگا کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کے مصائب کا بوجھ ہلکا کرنے کی کون کوشش کریگا۔

قرآن کے عدالتی نظام کی طرف خوشگوار پیش رفت

حال ہی میں وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد خاں صاحب نے، شراب نوشی کے ایک مقدمے کے سلسلے میں ایک اہم فیصلہ دیا ہے۔ جو مروجہ عدالتی فیصلوں سے کسی قدر مختلف ہے، اس عدالتی فیصلے کی تفصیلات ۷ جولائی ۱۹۸۵ء کے قومی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ فیصلہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق قرآن مجید کے عدالتی نظام کی طرف ایک خوشگوار پیش رفت ہے، اس لئے ہم قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

۷ جولائی کے قومی اخبارات میں، اس مقدمے کی جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں، ان کے مطابق، اس مقدمے کے ملزم کو مورخہ ۲ فروری ۱۹۸۲ء کو شراب نوشی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مجسٹریٹ درجہ اوّل نے حدود آرڈیننس کے آرٹیکل گیارہ کے تحت ملزم کو ۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو دو سال قید سخت اور دس کوڑوں کی سزا سنائی، ملزم نے مجسٹریٹ کے اس فیصلے کے خلاف ایڈیشنل جج کی عدالت میں اپیل دائر کی، جو خارج کر دی گئی، اس کے بعد اس نے وفاقی شرعی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اپیل کنندہ کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے شراب پی کر کھلے عام غُل غپاڑہ کیا، تاہم اس کے خلاف یہ الزام ثابت نہ ہو سکا کہ اس نے نشے کی حالت کے دوران کسی شخص کو زخمی کیا ہو، یا کسی کی جائیداد کو نقصان پہنچایا ہو۔ وہ ضمانت پر رہا تھا اور وفاقی شرعی عدالت میں حاضر ہو کر، اس نے اس برائی سے آئندہ کے لئے توبہ کرنے کا اعلان کیا۔ عدالت نے اس کے جرم اور دوسرے متعلقہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ دیا، کہ مجرم کو فوری سزا دینے کی بجائے، اصلاح کا موقع دیا جائے۔

فیصلے کے مطابق، اسے لاہور کے ایک نگران افسر کی نگرانی میں ایک سال کے لئے سونپ دیا گیا، اس عرصے کے دوران، اس کے لئے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اچھے چال چلن کا مظاہرہ کرے اور نشہ آور چیزوں سے اجتناب برتے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے اچھے چال چلن کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے ہر ماہ نگران افسر کو رپورٹ کرے گا اور وہ افسر ایک سال کا عرصہ گزرنے کے بعد، اس شخص کے چال چلن کی بابت عدالت کو رپورٹ کرے گا۔ عدالت نے مزید حکم دیا کہ یہ مقدمہ ایک سال کے بعد پھر پیش کیا جائے۔ اور اگر ملزم نے

اس عرصے کے دوران اچھے چال چلن کا ثبوت نہ دیا تو پھر اس کے خلاف شریعت اسلامی کے احکامات کے مطابق، مناسب کارروائی کی جائے گی۔

وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ، قرآن مجید کے عدالتی نظام کی روح کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس روح کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے جرائم کی سزا کے بارے مختلف انسانی معاشروں میں جو طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، اس کی ایک جھلک قارئین طلوع اسلام کے سامنے پیش کر دی جائے۔

ہر معاشرے میں دعویٰ تو یہی کیا جاتا ہے کہ مجرموں کو سزائیں، اس لئے دی جاتی ہیں، کہ ایک تو معاشرے کو ان کے کیئے ہوئے جرائم کے مفاسد سے پاک کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ان مجرموں کی اصلاح کی جائے، لیکن قارئین جانتے ہیں کہ اس سزا کے لئے عام طور پر جو طریقے اختیار کیئے جاتے ہیں ان میں انتقام کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے اور عام طور پر مختلف درجوں کے سرکاری افسر اور اہلکار ملزموں اور مجرموں کو سزا دے کر اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عام طور پر ملزم اور مجرم میں فرق نہیں کیا جاتا اور دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پولیس کا ڈرائنگ روم، والا روائیتی طریقہ ہمارے معاشرے میں خصوصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

انتقامی سزا کے اس طریقے کی ابتداء آج سے ہزاروں سال پہلے، رومن معاشرے سے ہوئی تھی۔ اُس معاشرے میں مجرموں کو سزا، ان کی اصلاح کے مقصد کے لئے نہیں دی جاتی تھی بلکہ عملاً ان سے انتقام لیا جاتا تھا۔ یورپ میں سینکڑوں سال اسی انتقامی سزا کے اصول پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں اس طریقہ کو خلاف انسانیت سمجھتے ہوئے اس میں کچھ نرمی اختیار کی گئی ہے۔ لیکن اسے بالکل ترک نہیں کیا گیا۔ خاص طور پر ایشیا کے جن علاقوں میں یورپ والوں کی حکومت رہی ہے وہاں آج بھی انتقامی سزا کا طریقہ اپنی پوری سختیوں کے ساتھ مروج ہے۔

اس انتقامی سزا کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجرم میں اصلاح کی بجائے، جذبۂ انتقام پرورش پانا شروع ہو جاتا ہے۔ جو اسے جرائم کے ارتکاب پر دوبارہ اکساتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ شخص پکا مجرم بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ معاشرے سے جرائم کے خاتمے کے لئے مجرموں کو سخت سزا دینے کی ضرورت ہے اور اسلام نے بھی اس مقصد کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ ان شرعی سزاؤں کی حکمت

کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"بعض جرائم کے ارتکاب پر شریعت اسلامیہ نے شرعی حدود مقرر کر رکھی ہیں یہ جرائم ایسے ہیں کہ ان کے ارتکاب سے، زمین پر فساد پھیلتا ہے، نظام تمدن میں خلا پیدا ہوتا ہے اور مسلم معاشرے کی طمانیت اور سکون قلب رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ جرائم کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں، کہ دو چار بار، ان کا ارتکاب کرنے سے اُن کی بُری عادت پڑ جاتی ہے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے جرائم سے باز رکھنے کے لئے، محض آخرت کے عذاب کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ان کے ارتکاب پر ایسی عبرتناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب، ساری عمر معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، اور دوسرے افراد کے لئے باعثِ عبرت بن جائے اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ، اس قسم کے جرائم کرنے کی جرأت کریں۔ اس کی ایک واضح مثال جرم زنا ہے، زنا کا محرک، نفسی خواہش کا غلبہ ہے۔ عورتوں کے حسن و جمال سے اس جذبے کو تقویت ملتی ہے اور یہ ایک ایسا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے عورت کے اہل خاندان کو سخت رسوائی اٹھانی پڑتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے کشت و خون ہوتا ہے، چونکہ اکثر یہ فعل فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی چوری چھپے۔ اس لئے اگر اس کی عبرتناک سزا نہ رکھی جاتی تو اس برائی کے پھیل جانے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی۔ (حجۃ اللہ البالغۃ جلد دوم صفحہ ۱۵۸)

اسلام نے مختلف جرائم کی سزائیں سخت مقرر کی ہیں، اور ان کا مقصد وہی ہے، جو اوپر شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن اسلام میں ان سزاؤں کی بنیاد محبت اور شفقت پر ہے۔ رومن قانون کی طرح انتقام پر نہیں، اسلامی سزائیں ایسی ہیں جیسی کہ باپ اپنے غلط کار بیٹے کی اصلاح کے لئے اسے دیتا ہے یا بعض اوقات ایک شفیق استاد، اپنے شاگرد کی تادیب کے لئے ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان سزاؤں کا مقصد مجرموں کی اصلاح ہوتی ہے تاکہ معاشرہ سے بدی کے اثرات ختم کئے جا سکیں۔ لیکن سزا کے نفاذ سے پہلے مجرم کو اپنے جرم سے تائب ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر وہ سچے دل سے توبہ کرے تو اس کا گناہ معاف کر دیا جاتا ہے لیکن یہ توبہ صرف زبانی نہیں ہوتی بلکہ اس کی توبہ کے بعد اس کے چال چلن کو جانچا جاتا ہے اور اگر یہ واضح ہو جائے کہ مجرم نے سچے دل سے توبہ کی تھی اور دوبارہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کرتا تو پھر اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید نے اسلامی حکومت اور مومنوں کے لئے لازم قرار دیا ہے، کہ وہ اس مجرم کے چال چلن پر نظر رکھیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔ اَلَمْ يَعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ

وَيَأْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (سورۃ التوبۃ۔ آیات ۱۰۴-۱۰۵)

(ترجمہ) کیا انہیں خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور (اس مقصد کے لئے) ان (توبہ کرنے والوں) کے صدقات منظور فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور اے رسول ان (توبہ کرنے والوں کو) کہہ دو کہ وہ عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور مومن ان کے اعمال کو دیکھیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۱۰۵ میں توبہ کرنے والے مومنوں کے اعمال پر نظر رکھنے کا حکم دیا ہے، وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ زیر نظر میں اسی قرآنی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے توبہ کرنے والے مجرم کے چال چلن پر ایک سال کے لئے نظر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اگر ہماری عدالتیں اور قانون کا نفاذ کرنے والے تمام ادارے مقدموں کا فیصلہ کرتے وقت اس قرآنی اصول کو سامنے رکھیں، تو اس کے ہمارے معاشرے پر نہایت ہی خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

(شاہد عادل از میانوالی)

ضرورت رشتہ

ایک قرآنی گھرانے سے متعلق، ۲۳ سالہ، خوش گل اور خوب سیرت دوشیزہ کے لئے جو تھرڈ ایئر کی طالبہ ہے، مناسب رشتہ مطلوب ہے۔ وہی حضرات (بذریعہ والدین یا سرپرست) رابطہ قائم کریں جو فضول رسومات و خرافات کے مقابلہ کی جرأت رکھتے ہوں۔

خط و کتابت

(ط۔س) معرفت ادارہ طلوع اسلام

جشنِ نزولِ قرآن کے موقع پر بزمِ طلوعِ اسلام گوجرانوالہ کے اجتماع میں باباجی کی یاد

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

برادرانِ گرامی قدر السلام علیکم! مشرق و مغرب میں ہوا کے دوش پر جب یہ خبر ایک عالم نے سنی کہ ہمارے باباجان، مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز صاحب اس جہانِ فانی سے اپنی زندگی کی دوسری منزل کے لئے روانہ ہو گئے، یہ خبر کیا تھی۔ ایک تیرِ نیم کش تھا۔ جو جگر کے پار نہ ہوا یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔ یہ خلش ایک لازوال نشانی ہے باباجی کی ہمارے لئے۔ سرمایہ ہے ہماری زندگی کا۔ وہ قرآنی زندگی، جس کی شمع زمانے کے دلوں میں آپ نے روشن کی۔ یہی ہے وہ دنیا جس میں ہم بس رہے ہیں۔

کانوں نے یہ خبر سن کر دل کو بتائی۔ گوش و دل نے انکار کر دیا۔ دل کی دھڑکن بند ہو گئی، سانس رک گئی۔ ایک لمحے کے بعد جب قانونِ خداوندی کو سامنے لایا گیا تو ان دونوں کو بے بس پایا۔ اور ان کو قانون نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ وہ قانون جو ہر بلندی و پستی کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ہمارے گلستان کے بوٹے کی شاخِ نازک سے موت نے جب اس پھول کو توڑا۔ تو گلستان کے تمام بوٹے کانپ اٹھے۔ اس کا پتہ پتہ تھرتھرایا۔ آسمان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں زمین کانپ اٹھی۔ ایک خزاں تھی جو اس بہار پر آئی۔ دیکھئے اہلِ بزم جب کبھی اس گلستان میں بہار آئے مجھے آواز دینا۔ تاکہ میں بھی اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دے کر اسے بلا لوں۔ اور اس میں شامل ہو جاؤں۔

اس عظیم مفکرِ قرآن سے پہلی ملاقات آج سے تقریباً پچیس سال پہلے ایک کنونشن کے موقع پر ہوئی۔ گلبرگ کی ایک کوٹھی کے کھلے پلاٹ میں سینکڑوں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں شامیانے اور قنات سے آراستہ، درمیان میں ایک چبوترہ، اس کے اوپر ایک بڑا میز ایک کشادہ کرسی، مفکرِ قرآن باباجی کا انتظار، کتنی بیتابی تھی ہم لوگوں کی۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ دیکھا کہ ایک درویش منش جس کا اطمینانِ قلب اس کے چہرے پہ جھلک رہا تھا نظر آیا۔ سوچا! کہاں سے پائی ہے اس نے یہ درویشی کہ اس کی بے نیازی کا چرچا خداوندانِ قوم کی محفلوں، مجلسوں میں ہوتا ہے۔ ایک دراز قد انسان ڈھیلا ڈھالا شلوار کرتہ پہنے خراماں خراماں شامیانے کے راستے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بغل میں قرآن عظیم

اس کے ساتھ ایک فائل ، شامیانے کے نیچے تمام نشتیں پُر تھیں ۔ باباجی چبوترے پر چڑھے تمام مجمع کو زبان اور ہاتھ کے اشارے سے سلام علیکم کہی اور بیٹھنے کو کہا ۔ جو تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے ۔ اس کے بعد خود کرسی پر بیٹھے ۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوا ۔ اس کے بعد کلامِ اقبال نے اس فضا میں اور نکھار پیدا کیا ۔

ع وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

خطاب کیا تھا ۔ ہمارا باباجی قرآنی تیغ کی نوک سے ہر غیر قرآنی خداؤں کو اپنے راستے سے ہٹاتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔ اور اس دور کے فرعون ، ہامان اور قارون کے تمام بت منہ کے بل گر کے ھواللہ احد کہتے لڑھکتے نظر آ رہے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو قوتِ قلم و بیان علم بالقلم ، علمہ البیان کی عطا کی ہے ۔ اس مردِ خدا نے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ۔ دورِ ملوکیت میں قرآن سے دور رکھنے کے جو حربے وضع کئے گئے تھے اس کا پردہ نہایت محققانہ انداز میں یوں بیان کیا ۔ کہ بادشاہ اور فرشتے بھی یہ کہہ رہے ہوں گے :۔

ع یہ کون غزل خواں ہے پُر سوز نشاط انگیز

یہ پرویز اپنی فقیرانہ متاع کو امت کے قافلے میں لٹاتا ، تھکاتے لگاتا سلسبیل کی صحیح تفسیر کو اپنے عالمانہ ، فاضلانہ وادیبانہ رنگ میں دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا ہوا رکنے میں نہیں آ رہا تھا ۔

طالب علمی کے زمانہ میں غالب ، حالی ، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر اقبالؒ کا کلام ہمارے کورس میں شامل تھا ۔ اس لئے اُردو ادب سے تھوڑا بہت لگاؤ تھا ۔ ڈاکٹر اقبالؒ کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کو لازم گردانا جاتا تھا ۔ یہی یہ جذبہ کشاں کشاں مجھے پرویز کی بزم میں لے گیا ۔ اس مردِ خدا مست کی رفاقت نے ہمارے دل میں قرآن کی جوت جگائی ۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اکثر لوگ قرآن کو سن کر ہدائت یافتہ ہو جاتے ہیں اور اکثر گمراہ ۔ یہ ایک دیرینہ مرضِ کورنگاہی ہے ۔ دیکھئے باباجان ! مجھے اس پر کوئی ناز نہیں ۔ کہ آپ کی بزم میں آگیا ۔

ع بہ تلاشِ خود چہ می نازم کہ راہ سوئے تو برد

ہم سے باباجی کا اتنی جلدی جدا ہو جانا ، سمجھ میں نہیں آتی بات :۔ اسّی نوّے سال کی درمیانی عمر میں پُر عزم اور پُر دل لوگوں نے بڑے بڑے میدان مارے ، معرکے سر کئے ۔ اورنگ زیب عالمگیر نوّے سال کی عمر میں بھی تختِ طاؤس پر جلوہ فرما رہا ۔ اور ان لوگوں کی یاد آج بھی ہمارے دل کو گرماتی ہے ۔ مانا کہ جنّت کے فرشتے آپ کو آنکھ کے اشارے سے ہی اپنے پاس لے گئے تمہاری اس سادگی پہ مر جانے کو جی چاہتا ہے ۔ میں نے ان کی یہ بات بھی سُنی ۔ کہ :۔

کہتے ہیں فرشتے دل آویز ہے پرویز !

لیکن باباجان ذرا دوسرے پہلو پر نگاہ دوڑایئے ۔ جو مردوں کو شکائت ہے ۔ کم آمیز ہے پرویز

آپ کے داخلۂ فردوس کا جب اعلان ہوا ہوگا یہ خبر عام ہوئی ہوگی۔ کہ احمدؐ کا ایک غلام پرویز آج صبح صادق کے وقت جنت میں داخل ہو رہا ہے۔ تو مومنین، فرشتہ و حور کا ایک جم غفیر جنت کے دروازے پہ آپ کے استقبال کے لئے کھڑا ہوگا۔ کیا عجب ہوگا وہ نظارہ، تم نے فرشتوں، مومنوں سے ہاتھ ملایا۔ سلامٌ علیکمُ کی آواز فضا میں گونجی۔ مگر دوسری طرف حوریں! ان کو ہاتھ کے اشارے اور منہ سے سلام علیکم کہتے مسکراتے آگے بڑھے اور ان کا یہ مطالبہ پس پشت ڈال دیا۔ ع:-

شور و غوغا از بہار" از یمین "
یک دو دم با ما نشین با ما نشین

یہ کیا بات ہوئی آپ تو درس قرآن کے موقع پہ طاہرہ بیٹیوں کو اپنے بائیں طرف (دل کے نزدیک) جگہ دیا کرتے تھے۔ لیکن اب باباجی ہیں کہ مومنوں کی قطار میں آگے اور آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ع:-

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

ہفتہ وار درس قرآن جو ادارہ طلوع اسلام کے سبزہ زار میں ہوا کرتا تھا (اب بھی) ایک طرف طاہرہ بیٹیاں دوسری طرف سلیم بیٹے، کاپی پنسل اور قرآن ہاتھوں میں لئے اکثر دیکھے گئے درس قرآن کیا تھا:- اندکلید دین و در دنیا کشاد- اور آپ کا بار بار کہنا کہ لکھتے جاؤ! کیا لکھیں ہم لوگ۔ ایک طرف ہمارے ہاتھوں میں چھریاں اور سیب دیتے ہو اور دوسری طرف یوسف کو بے حجاب ہمارے سامنے لاتے ہو۔ ہم اپنے ہاتھ نہ کاٹ لیں تو اور کیا ہو باباجان۔ خیر۔

اس طرح قرآن کا مفہوم بیان کرنا، دین کی غرض و غائت پر روشنی ڈالنا، دین اور مذہب کا فرق سمجھانا۔ بھائی تنت کڑھ کے رکھ دا نیداسی ساڈا بابا۔ اہل بزم کی آنکھیں باباجی کے چہرے پر جو دل کی کیفیت کا آئینہ دار، اور کان نصیحت نیوش، اس کی آواز پہ یہ طاہرہ بیٹیاں یا مٹی کی عورتیں۔ اور یہ سامنے سلیم بیٹے ہیں یا پیکر آب و گل۔ مانا کہ یہ کانوں سے سن رہے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ..... لیکن ان کے منہ کیوں کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں مقام تحیّر لیکن ما زاغ البصر:۔

ہمیں پورا یقین ہے اس بات کا کہ باباجی کے سینے میں دم جبریل تھا۔ خدا کا کلام، جبریل کی معرفت قلب محمدیؐ پہ اس کا نزول۔ ایک انقلاب برپا کر دینے والا پیغام۔ جب بھی کوئی انسان قیامت تک اس بگل کو پھونکے گا۔ انقلاب برپا ہوگا۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب:۔ لیکن یہ قیامت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین۔ پرویز صاحب کے عشق و محبت رسول کا یہ عالم کہ بر فتراک صاحب دو لتے بستم سر خود را لپسر۔ ایک زمانہ شاہد ہے۔ اجی باباجی ایک جہان تھا۔ کہ آپ کے بیان کو بڑے شوق سے سن رہا تھا۔ تم ہی سو گئے ہو بیاں کرتے کرتے!!

آپ کب سوتے تھے؟ تمہاری راتیں کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی میں کٹا کرتی تھیں۔ ہاں یہ اونگھ، نیند آگئی آپ کو، یہ بقول آپ کے نہایت قلیل عرصے کے لئے ہے۔ یہ ہم پس ماندگان کے لئے ہے۔ انسانی عقل اس سے آگے راہ نہیں پاتی۔

قرآن کے بحرِ ذخار میں غواصی کرنا اور موتی ڈھونڈ کر لانا آپ کا شیوہ اور زندگی کا نصب العین اور اس چالیس پچاس سالہ غور و فکر، تدبر و دانشِ نورانی کا ماحصل۔ لیکن ابھی اس بحر میں تھے لاکھوں لؤلؤ و لالائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس طلوع اسلام مشن میں اپنا پورا حصہ پورا کر چکے۔ اس کی راہ میں جو کانٹے تھے چن چکے۔ ایک عظیم احسان ہے آپ کا اب آئندہ آنے والی نسل کا فریضہ ہے۔ اسے آگے بڑھاتے جائیں۔ ایک بہت مشکل گھاٹی تھی۔ جو آپ نے تن تنہا سر کی

ع محبت کرنے والے کم نہ ہونگے نہ ہونگے تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

تمہارے یہ الفاظ ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ رُلا رہے ہیں۔

ع کیا کیا مجھے یاد آیا جب یاد تیری آئی

قیامِ پاکستان میں آپ کا کردار سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ تمہاری کہانی غیروں کی زبانی ہم تک پہنچی۔ آپ خود تو اس معاملے میں چپ رہتے تھے۔ غیروں کی زبانی تمہاری کہانی کی آپ نے تردید نہ کی اور نہ کوئی تبصرہ۔ اس لئے اسے سچ جانا۔ برِ عظیم ہندوستان میں تقریباً پچیس سال آپ نے نظریۂ پاکستان کی پُرزور تائید کی، دلیل و برہان سے قرآن کی روشنی میں کی۔ سنتِ نبوی کا چراغ ہاتھ پر رکھ کر کی۔ امام الہند ہو یا امامِ دیوبند، نیشنلسٹ مسلمان ہو یا کوئی اور نام نہاد مسلمان۔ تو مردِ مومن کی طرح ان سے بے تیغ لڑا۔ اور سنتِ رسول نے تیرا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اس کا دامن تو نے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں انکار کرنے والوں سے بے تیغ لڑتے رہے۔ آپ کی عظمت کی شہادت (مشتے از خروارے) اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ بقول مولانا کوثر نیازی اور پیر علی محمد راشدی (دو گواہ) کہ غلام احمد پرویز ہی فردِ واحد تھا۔ یہی ایک عظیم انسان تھا جو ایک عظیم قائد کو بغیر وقت لئے مل سکتا تھا۔ کسی نے سچ کہا۔ ولی را ولی می شناسد۔

ایک عرصہ سے طلوع اسلام کے سالانہ اجتماع ملکی حالات کے باعث منعقد نہ ہو سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا انعقاد بھی آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوا۔ ہر کنونشن کی الوداعی تقریب آپ کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی اور اس وقت آپ کی حالت دیدنی۔ اور یہ مصرع اکثر آپ کی زبان پر ہوتا ع:۔ ہزار بار بروصد ہزار بار بیا۔ اور اُن کی آخری دل سے نکلی ہوئی بات کہ میں اس موقع پر اپنے آپ کو تمہارے درمیان پاکر اپنی زندگی کو طول دیتا ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو۔ ع یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے ع کیا عظیم مفکر قرآن تھا کیا پیارا باپ تھا۔

ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔

محمد صادق
بزم طلوع اسلام، گوجرانوالہ

مفکرِ قرآن سے فیضیاب ہونیوالے ایک ریٹائرڈ میجر جنرل کے تاثرات

اواخر دسمبر ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ شیخوپورہ کے سول کوارٹرز کے باہر چارپائیوں پر بیٹھے ہم کچھ دوست دھوپ تاپ رہے تھے۔ میرے والد مرحوم کے ایک ساتھی ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے کلرک مولوی محمد شفیع صاحب نے مجھے ایک رسالہ تھما دیا اور مشورہ دیا کہ پڑھنے کی چیز ہے۔ میں فوج میں کپتان تھا۔ دو چار روز کی چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔ اسلام کے ساتھ شغف تھا۔ عربی میں بی اے (آنرز) کے بعد شغلاً بھی عربی کا مطالعہ جاری رکھا تھا۔

رسالے کا نام "طلوعِ اسلام" تھا۔ میری نظر سے پہلی بار گذرا تھا۔ اس سے پہلے مروّجہ اسلام کے ہر قسم کے رسائل کا مطالعہ تھا۔ جماعتِ اسلامی کا ترجمان القرآن باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ طلوعِ اسلام کے اس رسالے میں (شاید دسمبر ۱۹۴۹ء) ایک ہی مضمون تھا "اسبابِ زوالِ امت" کسی پرویز صاحب نے لکھا تھا جن کی نہ کوئی تحریر میری نظر سے گذری تھی اور نہ ہی میں ان کے نام سے واقف تھا۔ جوں جوں مضمون پڑھتا گیا، قرآن کریم کو ایک بالکل نئے انداز سے سمجھنے کا طریقہ سامنے آیا۔ بڑا ہی معقول نظر آیا۔ پہلی چیز تو عربی الفاظ کے معانی تھے۔ جو مروّجہ معانی سے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً زور اس بات پر تھا کہ مسلمانوں نے جب سے آخرت اور حیات بعد الممات کو ایک ہی زندگی سمجھنا شروع کیا تب سے ان کا زوال شروع ہوا۔ مضمون نگار کا مؤقف تھا کہ قرآن کریم میں بالعموم دُنیا سے مراد مستقبل قریب اور آخرت سے مراد مستقبل بعید ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو فہمِ قرآن میں ایک ڈرامائی تبدیلی آجاتی ہے۔ لغتِ عربی کی رعایت سے مضمون نگار کا مؤقف غلط نہیں تھا۔ دوسری چیز جس پہ زور تھا وہ یہ کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے "تصریفِ آیات" کے انداز کو زیرِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی ایک مقام پر قرآن کریم کے مطالب واضح نہیں ہوتے تو اسی قسم کی ملتی جلتی کسی اور آیت سے اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم خود ہی اپنے مطالب واضح کرتا چلا جائے گا اور اس کے حقائق کو سمجھنے کے لئے کسی اور لٹریچر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ بات بھی نہایت ہی معقول نظر آئی۔ میں بچپن سے اپنے محلے میں کالج میں اپنے رفیق طلباء کے ہاں اور فوج میں مسلم اور غیر مسلم افسران میں مولانا

مولوی یا ملّا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ایک مضمون کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہو گئی، اور مجھے شوق ہوا کہ اس اندازِ فکر سے قرآن کریم کو سمجھنے کی اور کوشش کی جائے۔

مضمون نگار نے اس مضمون کے مختلف مقامات پر مفصّل بحث کے لئے اپنی چار کتابوں کے حوالے دیئے تھے۔ معارف القرآن حصّہ اوّل تا چہارم۔ میں نے فوراً یہ چاروں کتابیں منگوائیں اور ان کو بہت غور سے پڑھا۔ پرویز صاحب سے متاثر ہو کر میں نے از خود بھی قرآن کو ایک نئے انداز سے سمجھنا شروع کیا اور مجھے خوشی ہوئی کہ کم از کم میرے ذہن میں اسلام۔ ایک نظریۂ حیات کے متعلق جو تضادات اور شکوک تھے، وہ تیزی سے رفع ہونے شروع ہو گئے۔ میری عربی سے اچھی واقفیت میری معاون ہوئی ورنہ یہ انقلابِ فکر اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ پرویز صاحب کی تحریرات سے ایک مزید فائدہ یہ ہوا کہ اقبالؒ کو میں صحیح طور پر سمجھنے لگا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ حالانکہ میں نے اقبالؒ کو بہت دفعہ پڑھا تھا۔ اس کے اشعار پہ بہت مرتبہ سر دھنا تھا۔ خیال تھا کہ میں اس کو سمجھ بھی لیتا ہوں۔ لیکن یہ صحیح نہیں تھا۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے قرآنی فکر کا علم ضروری ہے ورنہ اقبالؒ کے ساتھ زیادتی ہے جس طرح قرآن کریم میں چند اصطلاحات مثلاً وحی، صلوٰۃ زکوٰۃ، شکر اور صبر وغیرہ کے مخصوص معانی ہیں، اسی طرح اقبالؒ نے علم، عشق، فقر، قلندر وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ جب تک قرآنی فکر کی روشنی میں ان کا صحیح مفہوم متعین نہ ہو اقبالؒ کے افکار کو کما حقہٗ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اوائل ۱۹۵۰ء میں میں میجر رینک میں کوئٹہ متعین تھا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست میجر اسحاق محمد انہیں دنوں قلات میں متعیّن تھے۔ میجر اسحاق بہت بلند اخلاق کے مالک نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دلیر افسر تھے کوئی دو تین سال سے میری ان کی شناسائی تھی اور مختلف موضوعات پر ہمارے درمیان اکثر گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ میں تھا ذرا آزاد خیال ملّا۔ پرویز کی قرآن فہمی کی تکنیک سے ناواقف لہٰذا اکثر لبرل خیالات کی بحثوں میں آ کر کافی (CONFUSED) میجر اسحاق بھی ہمارے زمانوں کے مسلمان نوجوانوں کی طرح روایتی اسلام سے بخوبی واقف تھے۔ لغتِ عربی کی بھی اچھی سدھ بدھ تھی۔ سوشلسٹ خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور میرے حساب سے مبنی بر انصاف معاشرے کے قیام کی تجاویز کے بارے میں بحث میں ان کا ہاتھ اوپر ہوتا تھا۔ ویسے بھی طبعاً ہار ماننا پسند نہیں کرتے تھے۔ جوں جوں میری قرآن فہمی میں پرویز ہی اثر نمایاں ہوتے لگا، میجر اسحاق نے میرے مؤقف میں ایک خاصا انقلاب محسوس کیا اور اب بحث کے دوران اسلام کے معاملے میں کم (APOLOGETIC) ہونے لگا۔ اس نے یہ بھی محسوس

کیا کہ یہ تین چار نئی ضخیم کتابوں کے مطالعہ کا اثر ہے چنانچہ اس نے دریافت کیا کہ یہ موٹی موٹی کتابیں ملّا کا شاہکار ہیں۔ اسحاق کے پاس میرے کمرے کی چابی تھی۔ جب کبھی وہ قلات سے کوئٹہ آتا میری غیر حاضری میں میرے کمرے میں بلا تکلف چلا آتا۔ پرویز کی معارف القرآن اس کے ہاتھ لگیں اور اس نے ذرا دلچسپی لینا شروع کی۔ اگرچہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ خیالات کا اثر بہت گہرا تھا پھر بھی اسے اب اسلام سے کچھ اور شغف ہونے لگا۔ وہ یہ مانتا تو نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ پرویز اپنا کام کر گیا تھا۔

وسط سنہ ۱۹۵۰ء میں مجھے قلات سے اسحاق کا ایک تار موصول ہوا "اپنے پرویز کو ریلوے کے فلاں کوارٹر میں اتنے بجے ملو"۔ یہ کچھ زیادہ ہی اچھی خبر تھی۔ بہرحال میں نے چانس لیا اور واقعی وقت مقررہ پر پرویز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اسحاق بھی وہاں موجود تھے۔ پرویز صاحب ان دنوں مرکزی حکومت میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں دوستوں کے ساتھ قلات اور کوئٹے میں گذار رہے تھے۔ قلات میں وہ خان قلات کے ہاں ایک دعوت میں مدعو تھے۔ جہاں اسحاق سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ دو بڑے دماغوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا اور فوراً دوستی کا آغاز ہوا۔ خیالات مختلف تھے لیکن دونوں طرف خلوص تھا۔ اسحاق ان دنوں خان آف قلات کے فوجی مشیر تھے بعد میں پنڈی سازش کیس میں ان کے خلاف مقدمہ چلا سزا ہوئی۔ کوئی چار سال جیل میں رہے۔ فوج سے چھٹی ہوئی۔ وکالت پاس کی سیاست میں بھرپور حصّہ لیا۔ سنہ ۱۹۸۳ء میں وفات کے وقت مزدور کسان پارٹی کے صدر تھے۔ میری ان جیسے (genuine) سوشلسٹ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آخر وقت تک پرویز کے خیالات سے متاثر تھے البتہ وہ یہ مانتے نہیں تھے۔ لیکن اپنی ہٹ کے پکّے سوشلسٹ رہے۔ اور باتوں کے علاوہ میں ان کا مشکور ہوں کہ ان کے توسّط سے پرویز صاحب سے واقفیت ہوئی اور الحمدللہ یہ دوستی تیس سال سے زائد تک رہی۔

میں اور میجر اسحاق اکثر اوقات آدھی آدھی رات تک مختلف موضوعات پر پرویز صاحب کی سرکھپائی کیا کرتے تھے۔ پرویز صاحب بہت دھیمے مزاج کے استاد تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ بایں خیالات تم لوگ فوج میں ہو کیسے۔ زیادہ اشارہ اسحاق کی طرف تھا۔ ان بہت سی محفلوں میں قرآن کے اسرار و رموز بہت واضح ہوئے۔ ایک مرتبہ میں بعد از دوپہر ان کے ہاں گیا تو اپنے چچا ملک سعید صاحب کو جو زراعتی محکمے میں سینئر افسر تھے، وہاں سے نکلتے دیکھا۔ پرویز صاحب ذرا گرم تھے کیونکہ ان کے مزاج میں گرمی غیر معمولی بات تھی۔ میں نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے ابھی ابھی ایک ذاتِ شریف اٹھ کے گئے ہیں۔ کہتے تھے میں علم زراعت کا ایم ایس سی ہوں اور بڑا افسر ہوں اور مجھ سے ناراض اس لئے تھے کہ

میں کیسے کہتا ہوں کہ اسلام میں لونڈیاں جائز نہیں ہیں، اب تمہیں بتاؤ کہ ان پڑھے لکھوں کا کیا کروں۔ بندہ بشر ہوں کچھ غصہ آہی گیا۔ میرے چچا بھی تیز طبیعت کے نہایت پر خلوص روایتی مسلمان ہیں۔ ضرور انہوں نے چھبتے انداز میں بحث کی ہوگی۔

پرویز صاحب چھٹیاں گذارنے کے بعد کراچی واپس چلے گئے اور اگلی دفعہ ان سے ملاقات ان کے نیپئر بیرکس والے مکان میں ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ ایک دفعہ مجھے اپنے ساتھ پاکستان میں متعین مصری سفیر عبدالوہاب عظام پاشا صاحب کے ہاں لے گئے۔ یہ بزرگ اقبال کے شیدائی تھے۔ اقبال فہمی کے لئے اردو زبان بھی سیکھ رکھی تھی۔ اقبال کی شاید بال جبریل کا عربی منظوم ترجمہ بھی کر چکے تھے۔ پرویز صاحب سے شناسائی کے بعد ان دونوں کی گاڑھی چھنی اور اب وہ ضرب کلیم کا عربی منظوم ترجمہ کر رہے تھے۔ ضرب کلیم کا انتخاب پرویز صاحب ہی کی خواہش پر ہوا تھا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ ہفتے میں ایک بار دو بار ملاقات ہوتی۔ سفیر صاحب نے جس کلام کا ترجمہ کیا ہوتا وہ پرویز صاحب کو سناتے، کہیں کہیں اصلاح پاتے۔ اگلی نظم پر بحث ہوتی اقبالؒ کے خیالات کی گہرائی پر پرویز صاحب اجاگر کرتے اور سفیر صاحب ساتھ ساتھ عربی نظم میں ترجمہ کرنے کے انتظامات کرتے جاتے۔ اگلی نشست میں پھر وہی کارروائی دہرائی جاتی۔ کوئی تیس چالیس منٹ تک یہ منظر دیکھا۔ قرآنی خیالات ہجوم کرکے آتے۔ پھر چائے ہوتی۔ چائے کے وقفے میں سفیر صاحب نے مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ عمر میں پچپن ساٹھ سال سے کم نہیں تھے۔ فرمایا "میں عرب دنیا کی ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت ہوں۔ الحمدللہ کہ اپنے زمانے کا قریباً سب سے بڑا ادیب اور شاعر مانا جاتا ہوں لیکن جب سے پرویز صاحب سے ملا ہوں قرآن اور اقبالؒ دونوں کو اس طرح سمجھا ہوں کہ پہلے کا آموختہ قریباً سارا بھلانا پڑا۔ آفرین ہے اس شخص کی عربی دانی اور قرآن فہمی پر۔ اس نے میری عمر کے آخری حصے میں مجھے صحیح قرآن فہمی کی طرف چلایا ہے۔"

میں طلوعِ اسلام کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ فوج میں اپنے اور احباب سے بھی اکثر نئی سوچ پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ ایک چیز واضح تھی۔ کیونکہ افواج پاکستان کے افسران پر سر معاملے میں LOGICAL APPROACH پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اس لئے پرویزی فکر بہت جلد ان کی سمجھ میں آجاتی تھی۔ چنانچہ اس کا چرچا عام ہوا۔ ایک واقعہ جو اگرچہ بعد کا ہے لیکن یہیں اس کا ذکر کرتا چلوں۔ یہ شاید ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ پرویز صاحب میرے ہاں پنڈی آئے۔ انہیں فیلڈ مارشل ایوب صاحب نے ملاقات کے لئے بلوایا تھا۔ ایوب خان کے کان میں بھی اس نئی سوچ کی بھنک پڑی۔ انہیں پسند آئی اور پھر انہوں نے چاہا کہ یہ سوچ دور دور تک پہنچنی چاہیئے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ فوج میں ایک باقاعدہ مراسلہ آیا جس میں طلوعِ اسلام کی فکر کو سمجھنے اور عام کردینے کی ترغیب دی گئی بعد میں معاندین کی تدابیر

سے کچھ سالوں بعد ایوب خان ہی کے دور میں اس مراسلے کو واپس لیا گیا۔ پرویز صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک روز مجھے ان دنوں کے گورنر خان آف کالاباغ نے بلوا بھیجا اور مجھ سے کہا کہ میں نے آپ کو فیلڈ مارشل صاحب کے کہنے پر یاد کیا ہے۔ کچھ اسلام اور قرآن کی باتیں ہوئی اور خان صاحب نے مجھ سے کہا "یہ فیلڈ مارشل صاحب میرے اور ہر کسی کے سامنے تمہاری اور تمہاری سوچ کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں کی مرکزی حکومت کے محکمہ انٹیلی جینس سے ہمیں چٹھیاں ملتی رہتی ہیں کہ یہ پرویزی فکر ایک فتنہ ہے۔ اس کو دبانا چاہیئے۔ کبھی فیلڈ مارشل صاحب سے ملاقات ہو تو پوچھنا تو سہی کہ یہ تضاد چہ معنی دارد" پرویز صاحب کی اس ضمن میں ایوب خان سے پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔

۱۹۵۵ء میں میرا تبادلہ ملیر چھاؤنی میں ہو گیا۔ اب میرا معمول تھا کہ اور دنوں کے علاوہ اتوار کو باقاعدہ ان کے ہاں ایک INFORMAL محفل میں شریک ہوتا تھا۔ پرویز صاحب ابھی تک ملازمت میں تھے اور ہمہ وقتی قرآن کی خدمت کے لئے ۲۵ سال ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائرمنٹ کا ارادہ کر رہے تھے۔ شاید اسی سال وہ ریٹائر بھی ہو گئے۔ اتوار کو کوئی گیارہ بجے ہم چھ آٹھ احباب پرویز صاحب کے نیپئر بیرکس والے مکان کے احاطے میں ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں ان کے خیالات سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک بزرگ تھے ڈاکٹر سعید صاحب بہت عمر کے تھے۔ بندر روڈ پر سعید منزل والے۔ ایک صاحب گجرات کے۔ چھوٹی سی سفید داڑھی والے تھے۔ شاید کوئی برف کا کارخانہ تھا۔ کھاتے پیتے بزرگوار تھے۔ شیخ سراج الحق صاحب تھے۔ میں ہی شاید ان سب میں کم سن تھا۔ آپس میں مشورے سے یہ طے پایا کہ کیوں نہ اس محفل کو (FORMALISE) کیا جائے اور مختلف مضامین کے تحت پرویز صاحب قرآنی سوچ پر مبنی ایک تقریر کریں اور سلسلہ سوال و جواب ساتھ ساتھ ہو۔ کچھ دیر یہ سلسلہ چلا۔ احباب کی تعداد زیادہ ہونے لگی۔ کرسیاں کرائے پر آنے لگیں۔ چھوٹے شامیانے کی ضرورت پڑی۔ پرویز صاحب نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ قرآن کریم کا باقاعدہ ابتداء سے درس شروع کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اواخر ۱۹۵۵ء یا اوائل ۱۹۵۶ء میں باقاعدہ سورۂ فاتحہ سے درس قرآن کا آغاز ہوا اور اب اتوار کے روز اچھی خاصی محفل جمنے لگی۔ یہ سلسلہ جو کراچی میں شروع۔ الحمدللہ ۱۹۸۴ء تک پرویز صاحب کی وفات سے چند مہینے پہلے تک متواتر جاری رہا۔ اس چشمے سے کتنے لوگ فیضیاب ہوئے اس کا اندازہ ان ہفتہ وار اجتماعوں سے ہو سکتا ہے جو پاکستان اور بیرونِ پاکستان باقاعدہ برسوں سے متواتر کئی شہروں میں منعقد ہوتے ہیں۔ جہاں پرویز صاحب کا درس ٹیپ اور کہیں کہیں VCR پر سنایا جاتا ہے

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ بزم ہائے طلوعِ اسلام کا قیام وجود میں آنا شروع ہوا۔ مقصد تھا اس سوچ کو عام کرنا۔ "طلوع اسلام" کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے اس جریدے کو ہفت روزہ کر دیا گیا۔ یہ سکیم زیادہ عرصہ نہ چلی۔ شاید ایک برس کے بعد اسے دوبارہ ماہانہ کر دیا گیا۔ بزمہائے

طلوع اسلام کی مجالس کے سلسلے میں ایک نشست کراچی میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب کے ہاں منعقد ہوئی۔ قرآنی فکر عام کرنے کے سلسلے میں مشورے ہو رہے تھے۔ پرویز صاحب خود بھی موجود تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے لغات القرآن قسم کا ایک مسودہ تیار کر رکھا ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس کی چھپائی کا کام ہاتھ میں لیا جائے۔ پرویز صاحب سے پوچھا گیا انہوں نے تصدیق کی کہ میرے پاس اس قسم کا ایک اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ہے۔ اگر آپ لوگ چھپوانا چاہیں تو بسم اللہ کیجئے۔ میرے ہاں تو "درم و دام اپنے پاس کہاں" والا معاملہ ہے۔ میری اجرت یہی ہو گی کہ لوگ قرآن کریم سے متعارف ہوں اور درویش کی صدا کیا ہے" چنانچہ پیسہ جمع کیا گیا اور یوں یہ معرکتہ الآرا تصنیف چند لوگوں کی اعانت سے معرض وجود میں آئی۔ مجھے یاد ہے کہ اپنا ایک پریس بھی لگوانے کی تجویز تھی۔ میزان پریس۔ اس کے کوائف کا مجھے کچھ علم نہیں۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ لغات القرآن کے چھپنے کے جلد ہی بعد مفہوم القرآن کا ایک ایک پارہ چھپ کر سامنے آنا لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب پرویز صاحب کو مبلغات کا فکر دامن گیر نہ رہنے لگا ہو گا۔ شاید اسی وجہ سے ان کی تصنیفات اب جلد جلد سامنے آنے لگیں۔

پرویز صاحب کے کراچی میں بہت مداح تھے۔ ان کے ہفتہ واری درس میں بھی بہت رونق ہوتی تھی۔ درس اب کشمیر روڈ پر ان کے اپنے مکان میں منعقد ہونے تھے۔ لیکن پرویز صاحب کراچی کے موسم سے خوش نہ تھے۔ کہا کرتے تھے کہ یہاں بہت دردیں ہوتی ہیں۔ پنجاب جاتا ہوں تو بالکل نہیں ہوتیں۔ سراج الحق صاحب بھی لاہور منتقل ہو رہے تھے۔ انہوں نے حوصلہ بندھایا کہ مکان میں بنوا دوں گا۔ آپ اب ہجرت فرما ہی جائیں چنانچہ شاید ۱۹۵۸ء میں وہ گلبرگ لاہور چلے گئے۔ زندہ دلان پنجاب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پرویز صاحب نے کبھی شکایت نہیں کی کہ لاہور منتقلی سے ان کے پروگرام کے عام ہونے میں کوئی مداخلت ہوئی۔ بلکہ احباب کا خیال کہ اگرچہ لاہور کی آبادی کراچی سے کم تھی لیکن لاہور کے قرب و جوار میں آبادی بہت تھی اور وہاں تک آواز اب آسانی سے پہنچنے لگی۔ یہاں تک کہ اوائل ۱۹۵۹ء میں جب کہ میں جہلم میں متعین تھا محترم پرویز صاحب ایبٹ آباد سے لاہور جاتے ہوئے وہاں کچھ وقت رکے اور ایک نشست میں اچھے خاصے لوگ جمع ہوئے۔

لاہور میں پرویز صاحب بہت مصروف تھے۔ خوش تھے کہ اب تصنیف و تالیف کو وہ بہت وقت دے سکتے تھے۔ جب کبھی گئے اُن کو اپنی لکھنے والی مخصوص کرسی پر مصروف تحریر دیکھا۔ ایک دفعہ مجھے بتایا کہ سن ۳۲ء یا ۳۳ء میں انہوں نے معارف القرآن کا ایک نقشہ اپنے ہاں تیار کیا اور علامہ اقبالؒ کے مشورے سے اُس وقت کے بڑے بڑے علماء کو تحریری دعوت دی کہ ہم سب مل کر قرآن کا ایک انسائیکلو پیڈیا (معارف القرآن) تیار کریں۔ سال بھر انتظار کیا۔ کسی ایک نے بھی حامی نہ بھری۔ علامہ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر خود ہی شروع کر دو۔ پہلا قدم مشکل ہوتا ہے پھر دیکھنا سفر کیسے طے ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی کیا اور ہم

سب جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ پرویز صاحب کی اپنی زبانی سن لیجئے کوئی عراقی عالم لاہور آیا اور اس نے طلوع اسلام کے مصنفین کے ادارے سے ملنے کی خواہش کی۔ اسے بتایا گیا کہ مصنف تو ایک ہی ہیں جب چاہیں مل لیں۔ اس نے ماننے سے بالکل انکار کر دیا کہ اتنی ساری اس معیار کی کتابیں۔ ایک ہی آدمی نے لکھ دیں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ اس نے پرویز صاحب جیسے مجنوں کب دیکھے تھے۔

سنہ ۱۹۷۲ء سے میں ریٹائر ہو کر کراچی کے ایک صنعتی ادارے کے ساتھ منسلک تھا۔ ایک میرے عزیز دوست شمع قرآنی کے پروانے، علی محمد داؤد صاحب کے گھر پر ان کے ایک نوجوان دوست شائق عثمانی سے تعارف ہوا۔ باتوں باتوں پر قرآن کا ذکر چلا۔ عثمانی صاحب نے پہلی مرتبہ پرویز کا نام سنا۔ ان کی سوچ سے متاثر ہوئے۔ پوچھا کہ ان کا کوئی لٹریچر مل سکتا ہے۔ مفہوم القرآن کی تینوں جلدیں انہیں تھما دی گئیں۔ شائق صاحب نے بتایا کہ وہ پاکستان نیوی میں لفٹننٹ کمانڈر تھے۔ جلد ریٹائرمنٹ لے لی اور اب کسی مرچنٹ جہاز کے کپتان ہیں اور ایک دو روز میں لمبے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ کوئی دو سال کے عرصے کے بعد ان سے داؤد صاحب کے گھر پر پھر ملاقات ہوئی۔ ان ذات شریف نے مفہوم القرآن کے قریباً دس بارہ پاروں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہوا تھا۔ مسودہ مجھے تھمایا اور خود جہازی سفر پر روانہ ہو گئے۔ ترجمہ مجھے بہت اچھا لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک عرصے سے خود پرویز صاحب مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ کرانے کی فکر میں تھے یہ تو گویا من و سلوٰی ٹپک پڑا۔ داؤد صاحب نے ان دس بارہ پاروں کو ٹائپ کرا دیا۔ میں نے ایک پارہ "نمونۃً" پرویز صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے بہت پسند کیا اور مجھ سے کہا کہ اس شخص کو کوئی چار چھ ماہ کے لئے مجھے ادھار دے دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری مراد پوری ہو جائے گی۔ اگلی دفعہ شائق صاحب آئے تو دس اور پارے ساتھ لے آئے۔ بھئی کیسے وقت نکال لیتے ہو اس محنت شاقہ کے لئے اس نے کہا کہ یہ تو محبت ہے۔ جہاز کا کپتان بڑی شئے ہوتا ہے وہاں اپنے کمرے میں بند ہو کر "اندر آنا منع ہے" کا بورڈ لگاتا ہوں اور گھنٹوں لگا رہتا ہوں۔ جہاں محبت ہو وہاں تھکاوٹ کیسی۔ پوچھا کہ پرویز صاحب سے ملو گے۔ ارے صاحب یہ سعادت ان کے پاس چار چھ ماہ گذار سکتے ہو۔ میرے بچوں کو کھانا کون کھلائے گا۔ ایک سال کے کورس کے لئے ولائت جا رہا ہوں۔ واپسی پر بات ہو گی۔ شائق صاحب ایک سال بیرسٹری کا کورس کر کے واپس آئے اور تیس پارے مکمل تھے۔ کیا محنت ہے۔ داؤد صاحب نے تیس پاروں کو ٹائپ کر دایا۔ ایک سیٹ پرویز صاحب کو پیش کیا گیا۔ اب ان کا اصرار تھا کہ بھئی شائق صاحب کو تو ضرور ملواؤ میں خود ان سے مفصل بحث کر کے اسی ترجمے کو بنیاد رکھ کر ذرا اپنی طبیعت کے مطابق ڈھالوں گا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پاس ایک سے زائد مکمل ترجمے موجود ہیں لیکن شائق صاحب والی بات کہیں نہیں۔ بڑی مشکل سے شائق صاحب نے کہ اب کراچی کے مشہور (MARINE LAW) کے بیرسٹر تھے

کچھ (WEEK ENDS) دیئے اور یہیں ان کو ساتھ لے کر جون ۱۹۸۴ء میں چوہدری پرویز صاحب کے ہاں گیا۔ انہیں دنوں امریکہ میں کسی یونیورسٹی کی ایک پاکستانی خاتون لیکچرار ڈاکٹر رفعت حسن سال بھر کی رخصت پر آکر مفہوم القرآن کو انگریزی میں ڈھالنے کے لیئے پرویز صاحب کی مدد کر رہی تھیں۔ ان تینوں کی پہلی کانفرنس میں میں شریک تھا۔ انہوں نے پروگرام متعین کر لیا۔ کام شروع ہوا۔ فون پر پرویز صاحب سے خبر ملتی رہتی تھی کہ ترجمہ تیزی سے ہو رہا ہے۔ جن دنوں اس کام میں سخت مصروف تھے، میرا لاہور جانا ہوا۔ حسبِ معمول ملاقات ہوئی کہنے لگے کہ انگریزی زبان اب سائنسی اصطلاحات میں تو بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن فلسفی اصطلاحات میں بہت پیچھے رہ گئی ہے کہ اب مغرب کے مکینوں نے شاید فلسفے اور بلند اقدار کی سوچ کا مشغلہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ فرمانے لگے کہ ایک عربی لفظ کے لئے کئی انگریزی الفاظ سامنے آتے ہیں سب مفہوم نہیں ادا کر پاتے۔ بہر حال محنت جاری ہے۔ کوئی تین چار ماہ تک سولہ سترہ پاروں کو انگریزی میں پرویز صاحب کی طبیعت کے مطابق منتقل کیا جا چکا تھا کہ وہ لیکچرار خاتون اس مقصد کیلئے فارغ نہ رہ سکیں۔ پھر وہ امریکہ چلی گئیں۔ امید تھی کہ جون ۱۹۸۵ء میں پھر تشریف لائیں گی تو یہ کام جاری رہے گا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ شمع محفل فروری ۱۹۸۵ء ہی میں بجھ جائے گی۔ پرویز صاحب کی بہت خواہش تھی کہ انگریزی میں مفہوم القرآن کو ڈھالا جائے ان کا اندازہ تھا کہ مغرب والے لوگ صحیح قرآنی سوچ سامنے آنے پر اسلام پر زیادہ توجہ دیں گے اگر ان کے اپنے ہاتھوں سے یہ کام انجام پائے تو الحمدللہ۔ بہر حال باقی تیرہ پاروں کا شائع صاحب کا کیا ہوا ترجمہ محفوظ ہے۔ کسی روز کسی کو یہ سعادت نصیب ہو گی کہ تیس پاروں کا ترجمہ ان سترہ پاروں کے ترجمے کی روشنی میں ہو جائے جو پرویز صاحب کی طبیعت کے مطابق تھے۔

اپنی عمر کے آخری سال میں پرویز صاحب کی صحت ہمارے حساب سے بہت اچھی تھی۔ موت تو ایک طبیعی تقاضا ہے لیکن انہیں دیکھ کر یہ شک نہیں گزرتا تھا کہ اب قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کا کام اور لوگوں کے سپرد ہو گا۔ کمر کی درد سے پرویز صاحب پریشان تھے۔ آپریشن سے پہلے اور بعد دو تین دفعہ ملاقات ہوئی۔ وہی ہنسی وہی مذاق پانچ چھ ہفتے سے صاحبِ فراش تھے۔ میں نے حال پوچھا کہنے لگے "ہڈ حرام" ہو گیا ہوں۔ پرویز صاحب کی پنجابی ترکیبیں کون سنائے گا۔

پرویز صاحب وفات پا گئے۔ یہ صحیح ہے کہ اب ان سے بالمشافہ گفتگو نہیں ہو گی۔ لیکن ہر روز ان سے ملاقات ہوتی ہے جب تک لغات القرآن، مفہوم القرآن اور ان کی دوسری معرکتہ الآرا تصانیف موجود ہیں پرویز صاحب زندہ رہیں گے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ "کتابِ زندہ" کے شارح تھے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان جیسے عظیم انسان کی زبانی کتاب زندہ کی تشریح سنی۔ ہم بہت ہی بدقسمت ہونگے اگر اس زندہ پیغام کو اور دور دور تک آگے نہ بڑھائیں نیشنل بینک کے ایک پیڑ کے نیچے ہونیوالی نشستوں سے دنیا بھر کے شہروں میں ہفتہ وار یا ماہانہ اجتماعات میں پرویز صاحب کی سوچ کے مطابق قرآن کریم کی تشریح یہ ایک لمبا فاصلہ ہے۔ یہ پیغام اور آگے بڑھے گا کہ یہ قانون فطرت کا تقاضا ہے۔ حق مغفرت کرے اس آزاد مرد کی جس نے ہمارے نقشِ ... [illegible]

مفکرِ قرآن کے ایک ذاتی معالج کے تاثرات

(قسط دوم)

باباجی کے متعلق کچھ ذاتی سے تاثرات لکھ کر اوّل تو میں نے اپنے دل کو ڈھارس دینے کی کوشش کی تھی، اور یہ باتیں کچھ فوری یاد آئی باتیں تھیں، بہت سی اور یادیں ذہن کے کونوں کھدروں میں باقی ہیں، شعور میں بھی اور لاشعور میں بھی،

طلوعِ اسلام میں اشاعت کا خیال اس لئے آیا تھا کہ بند ذہنوں اور تعصّب کے اس دَور میں اس مرد درویش کی باتیں کون برداشت کرے گا

لیکن جن لوگوں کو ان سے کچھ رابطہ رہا ہے، جو ان کی فکر سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں ان کو اس سے کچھ تو تحریک ہوگی، ان کے ذہنوں میں بھی کچھ یادیں تازہ ہوں گی، ان کے ذہنوں میں بھی کچھ تصویریں، کچھ نقوش ہوں گے، شاید وہ بھی ان کو الفاظ میں ڈھال کر ہمیں ان کی باتوں میں شریک کریں اور ہم ان کی یادوں کی محفل سجائیں،

آپ نے اس پر جو عنوان دیا اس سے مجھے کچھ اتفاق نہیں، حضرت میں ان کا ذاتی معالج کہاں تھا، اپنے تمام علاج تو وہ خود جانتے تھے، چلتوں، ریاضتوں، اور ان سے متعلقہ پرہیزوں نے معدے پر اثر کر رکھا تھا اس لئے کھانے پینے میں ازحد احتیاط رکھتے تھے، کشمیری نمکین چائے پسند تھی، میری بیگم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے ہاتھ کی بنی چائے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی اور کبھی ہمارا جی چاہتا تھا کہ اور لوگوں سے بچا کر انہیں کچھ دیر کے لئے اپنے پاس بٹھائیں، ان سے باتیں کریں، کچھ پوچھیں تو کہتے تھے باباجی آپ نمکین چائے پینا کب پسند کریں گے —— کہتے تھے بابا کو اغوا کرنے کا بہانہ کرتے ہو، ——

ہاں تو معدے کا ایک علاج ان کا اپنا تجویز کردہ آپ کو بتا ہی دوں، اس لئے کہ یہ انہوں نے مجھے بتایا تھا —— میرا معدہ بھی میری کمزوری ہے، ایک دن میں نے ان سے ذکر کیا —— کم کھاتا ہوں، پرہیز کرتا ہوں، پھر بھی —— کہنے لگے ادھر دیکھو، قمیض اٹھائی تو پیٹ پر ایک بائنڈر بندھا تھا، کہنے لگے معدے کو گرم رکھنے کے لئے یہ فلالین کا کپڑا باندھے رکھتا ہوں، تم بھی رکھو ——

یہ بات تو خیر میں نے برسبیل تذکرہ لکھ دی، ویسے بھی نہ میرا پہلا تعارف ان سے ڈاکٹر مریض کا تھا، نہ بعد کے رابطے کی بنیادی وجہ میرا پروفیشن تھا، —— انگریزی محاورہ استعمال

کروں تو کیوں FAR FROM IT مریض تو میں تھا، تذبذب اور تشکیک کے کانٹے دل میں، ذہن میں اضطراب اور بے یقینی جب بے چین کرتی تو سکون کی تلاش ان کے ہاں لے جاتی اور اس نسخہ کیمیا کی روشنی میں وہ یہ اضطراب دور کرتے، قلب کو سکون ملتا ذہن مطمئن اور ایمان پختہ ـــــــ قلوب کے عارضوں کے مسیحا تو وہ تھے،

سکون کے ذکر سے مجھے ایک اور بات یاد آئی ـــــــ

ایک دفعہ میں کچھ اداس سا، کچھ مایوس سا ان کی خدمت میں حاضر ہوا، کہا بابا جی آپ نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، دوسرے لوگ کبھی دلگیر ہوتے ہیں، اداس ہوتے ہیں، مغموم ہوتے ہیں ـــــــ اور جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اس میں ایسا تو اکثر ہوتا ہی رہتا ہے، قدم قدم پہ رکاوٹیں ہیں، قدم قدم پہ دل جلانے کا سامان، بے انصافی، اقربا پروری، رشوت، سفارش، حق تلفی، غلط بخشی اور جب انسان انہیں دور کرنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے، بے بس ہو تو،

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل
بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

کسی اور پہ یہ گذرے تو کوئی کسی مزار پہ، کسی دربار میں، کسی پیر کے آستانے پر، سر جھکا کر، ماتھا رگڑ کر، آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے، مطمئن ہو جاتا ہے، کہنے لگے اطمینان ہی کی بات ہے تو وہ تو لوگ افیون کھا کر، چرس کا سوٹا لگا کر بھی حاصل کر لیتے ہیں، یہ اطمینان مسائل کا حل تو نہیں،

میں نے سوچا تو میرا سر خدائے بزرگ و برتر کے حضور جھک گیا کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں مسائل پہ ان کے اصل تناظر میں غور کرنے کے قابل ہوں،

ہو میرا ان کا رابطہ تو اس قسم کا تھا، باتوں باتوں میں کبھی کسی معمولی تکلیف کا ذکر آ گیا، گھر کے کسی بچے کی یا آپا جی کی تکلیف کی بات آ گئی تو آ گئی، ـــــــ خود تو ان کی صحت مجھے ہمیشہ ہی تسلی بخش نظر آئی سوائے برسات کے نم آلود دنوں میں جب بلغم انہیں تنگ کرتی تھی۔

دراصل مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ انکی باتیں لکھتا لکھتا میں بھول گیا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں ـــــــ ذہن کی دیوار پہ یادوں کے نقشے کھنچ گئے، کھول کر بیٹھا جو میں عمر گذشتہ کی کتاب، میں ایسا کھو گیا ـــــــ میں سمجھا وہ میں کہیں آس پاس ہی ہیں،

تو جیسے مرے پاس ہے اور محو سخن ہے
محفل سی جما دیتی ہیں اکثر تری یادیں

کا سا معاملہ تھا۔ پہلے ہمیشہ طلوعِ اسلام میں چھپنے والے میرے مضامین پہ عنوان انہوں نے ہی دیئے، ایسا نہ ہوتا تو میں خود اس کا کوئی عنوان دیتا،

جو دگر دانائے راز آید کہ ناید ہو سکتا تھا،

چاروں طرف سناٹا ہے ہو سکتا تھا
دیوانے یاد آتے ہیں ہو سکتا تھا
اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے ہو سکتا تھا
ایسے لوگ اس دور میں افسانہ ہی تو ہیں، ان کے ذکر کو افسانوی عنوان دیتا تو کہتا،
اجنبی محاذ کا تنہا سپاہی'

آپ کی نیت پہ تو مجھے کوئی شک نہیں بلکہ حسن ظن ہی ہے، جو مقام آپ نے مجھے دیا وہ میرے لئے باعث فخر بھی ہے اور باعث سعادت بھی ——— لیکن شاید اسے ظلم بھی کہہ سکیں، انہی کی محفل سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ظلم یہی نہیں کہ وہ کسی کو وہ مقام نہ دیا جائے جس کا وہ حقدار ہو بلکہ اگر کسی کو اس کے جائز مقام سے بلند تر مقام پہ فائز کر دیا جائے تو وہ بھی ظلم ہوتا ہے ———

لفظوں کے استعمال میں احتیاط ان کے حضور لازم تھی، لفظ کے مڈھ (جڑ) تک پہنچنا ان کا طریقہ تھا، لفظ کا ماخذ، اس کے بنیادی معنے، اس کے مجازی معنے ———

مجھے یاد ہے رسالہ لیل ونہار کے شروع کے زمانے میں ایک دفعہ کچھ لوگوں نے کچھ دانشوروں، علماء، صاحب علم لوگوں سے مختلف موضوعات پہ انٹرویو لئے تھے، ان انٹرویو لینے والوں میں اشفاق احمد اور ناصر کاظمی مرحوم بھی تھے، پرویز صاحب سے باتوں کے بعد میں نے ناصر کاظمی کو اس بات کا اظہار کرتے سنا کہ توبہ بابا، لفظ تو ان کے سامنے ہاتھ باندھے ہی نہیں کھڑے بلکہ لرزاں ہیں کہ وہ ان کی اصلیت سے واقف ہیں ——— !

لغات القرآن اس سلسلے میں ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تنہا ایک ہی کتاب اگر کوئی ایسی لکھ جائے تو گویا پیدا ہونے کا حق ادا کر گیا، انہوں نے تبویب جیسا عظیم کام بھی کیا اور دوسری تصانیف بھی ہمیں دیئے گئے،

چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کئی باتیں یاد آتی ہیں، بلکہ اب تو شام کے وقت جب اکیلا ہوتا ہوں اور ذہن پہ کوئی مسئلہ سوار ہو تو جی چاہتا ہے بھاگ کر باباجی کے ہاں جاؤں اور پوچھوں ———

آنکھیں بند کرتا ہوں تو ان کی محفل میں جا حاضر ہوتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کوئی نئی بات ان سے اب نہیں پوچھ سکتا، پرانی یادیں جگا سکتا ہوں، انسان کا ذہن بھی عجیب شئے ہے، ماضی کی باتیں مدفون خزانوں کی طرح ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہوتی ہیں، بس مناسب بٹن دبانے کی ضرورت ہوتی ہے ——— باتیں، چہرے، تاثرات سبھی چیزیں سینما کے سکرین کی طرح زندہ سامنے آجاتی ہیں دیکھتا ہوں اسی طرح ڈھیلے ڈھالے موٹے جھوٹے کپڑوں میں ملبوس میز کے سامنے بڑی سی کرسی پر بیٹھے ہیں، آلتی پالتی مارے، چہرے پر مسکراہٹ آنکھوں میں شفقت ——— میں نے مایوسیوں کی باتیں کیں، انہوں نے امید کی نوید دی، امید کی یہی کرنیں سمیٹ کر میں گھر لوٹ آتا تھا، اب کوئی کرن بجھتی دکھائی دیتی ہے تو چاروں طرف سے ہواؤں کو سمیٹتا ہوں کہیں اسے بجھا نہ دیں، بجھ گئی تو اسے

دوبارہ جلانے، دوبارہ زندہ کرنے کے لئے روشنی کہاں سے لاؤں گا،

ملک میں قرآن کے پیغام کے عام ہونے میں سست رفتاری مجھے اکثر الجھن میں ڈالتی تھی، طبیعت جھنجھلاہٹ بھی ہوتی تھی، کبھی کبھی تو جی چاہتا تھا دیوانہ وار چلاؤں، جسے کہتے ہیں HOUSE TOPS سے آوازیں اٹھیں، آج کی اصطلاح میں کیوں لاؤڈ سپیکروں پہ شور ہو ——— میں نے دیکھا تھا کئی بار بہت سے نوجوان چہرے مختلف وقتوں میں درس کی محفلوں میں نظر آئے اور پرجوش بھی نظر آئے مگر آہستہ آہستہ غائب ہو گئے، ان کے کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا، تربیت کا یہ عمل بہت ہی سست رفتار اور وقت طلب ہے،

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

بے تابی تمنا سے گھبرا کر خدا معلوم کتنے عاشق، کتنے مجنوں کس کس صحرا میں نکل گئے۔

میں بھی کبھی کبھی ایسے گلے شکوے کرتا تھا مگر اُدھر سے وہی تلقین ہوتی تھی کہ سوچ کو بدلنا ہی سب سے بڑا مشن ہے اور یہ بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن عمل ہے خدا بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک اس کی سوچ نہ بدلے، ——— انقلاب ——— پھر لفظوں کی بات آگئی، ق ل ب سے بنا ہے، قلب کی تبدیلی، سوچ کی تبدیلی ہی کو انقلاب کہتے ہیں، باقی جسے دنیا آج انقلاب کہتی ہے وہ تو فساد ہے اور زمین پہ فساد پھیلانے والوں کو تو خدا پسند نہیں کرتا۔ ———

کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی فساد پھیلانے والوں میں سے ہو جائیں،

میں ہجرت کی بات لے کر بیٹھ جاتا ——— مگر وہ یہاں سے مایوس کب تھے، مایوسی سے تو وہ ناآشنا تھے ——— انہیں اس خطۂ زمین سے اتنی بے پایاں محبت تھی، کتنی تمنا تھی کہ اس خطۂ زمین میں وہ پودا اُگے جو بڑھ کر وہ شجرِ طیب بنے جس کی جڑیں پاتال میں اور شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہوں، یہاں ہی سب سے پہلے وہ معاشرہ متشکل ہو جس کے لئے ساری انسانیت آنکھیں کھولے منتظر ہیں، ———

وہ حوصلے، استقامت اور صبر کا سمندر تھے میری بے تابیٔ تمنا مجھے بار بار اکساتی تھی، باہر کے ملکوں میں جانے کی بات بار بار ذہن میں آتی تھی مگر اسے عمل میں کیسے لایا جائے وہ کیسے سوچے جو خود کبھی تفریحاً بھی ملک سے باہر نہیں گیا، سوچتا ضرور تھا اس کا بندوبست کیسے ہو کہ یہ روشنی کہیں تو فضا کو منور کرے، کوئی یونیورسٹی، امریکی یونیورسٹی ہو جہاں ایسے لیکچروں کا بندوبست ہو سکے ——— کوئی یونیورسٹی، کوئی ادارہ، بی بی سی، اے بی سی ——— ایسا ہو جائے تو شاید علامہ اقبال کے مدراس ——— میں دیئے تاریخی Reconstruction والے لیکچروں کے بعد بات مثبت انداز میں آگے بڑھے ———

قرآن کے معاشی نظام کے حوالے سے ایکدن میں نے کہا باباجی یہ تو آپ نے کہہ دیا جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے ——— مگر ایک اور ملک بھی تو ایسا ہے جو عادلانہ معاشی

نظام کے لئے کوشاں ہے اور اپنی تہذیبی بیک گراؤنڈ کو ساتھ لئے، اپنی جدوجہد اور اپنے فلسفے کو اپنے تہذیبی پس منظر سے جدا نہیں کرتے، خود کو کسی کا خوشہ چین نہیں سمجھتے، مارکس کے مرید نہیں ہیں بلکہ مارکس کے فلسفے کے اجارہ داروں کے موجودہ چہروں کو REVISIONIST کہتے ہیں ____

ابھی تو نہیں شاید آئندہ انکو بھی INCENTIVES والی مشکل پیش آئے۔ چاؤ اور ماؤ پریکٹیکل سیاست دان ہی نہیں، ماؤ تو بالخصوص سیاسی فلاسفر ہے ان سے بات ہو سکتی ہے، آپ نے کبھی چین جانے کا نہیں سوچا ____

کہنے لگے ہاں صدر ایوب کے زمانے میں ایک بار ایسا ہوا، چین کی ایک قابلِ ذکر ہستی سے ملاقات ہوئی، تفصیل سے بات بھی ہوئی، انہوں نے مجھے چین آنے کی دعوت بھی دی، بلکہ یوں کہا کہ آپ کو بلانے کا اہتمام بھی ہم کریں گے، آپ کا آنا جانا، رہنا سہنا ہمارے ذمے، ہم کو چین دکھائیں گے۔ چین کے رہنماؤں سے ملائیں گے، بات آگے چلی بھی، آخری مرحلے تک پہنچی، پھر یکایک سب کچھ ہمارا پروگرام ڈراپ کر دیا گیا۔

"کیوں ؟ بابا جی کیوں ؟" میں نے کہا

اب یہ میں کیا بتا سکتا ہوں، یہ حکومتوں کے معاملے ہیں۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند! ____
کیا اور سوچ میں پڑ گئے

پھر ایک ایسی بات کہی جو میں کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، برملا نہیں کہہ سکتا۔ بات زبانی تھی، کہیں لکھی ہوئی نہیں، کوئی اور موجود بھی نہ تھا، کہنے والا بھی اب ہم میں نہیں، ان کا کیا مطلب تھا میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا، الفاظ دہرانے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے، مگر جو کچھ میری سمجھ میں آیا وہ اپنے الفاظ میں آپ تک پہنچانا ضرور چاہوں گا،

یہ میں پہلے بتا دوں کہ وہ کمیونزم کو اسلام کی ضد سمجھتے تھے، ان کو دو مختلف بلکہ متضاد نظامہائے زندگی کہتے تھے، بلکہ کہتے تھے ہی دو اس دور میں نظامہائے زندگی ہیں جن کا اپنا اپنا فلسفہ ہے باقی تو سب سیکولر تجربے ہیں جن میں مذہب بندے اور خدا کا پرائیویٹ اور نجی معاملہ ہے، مذہب محدود حلقے میں مفید ہے اور روزمرہ کی زندگی، نظام حکومت، سٹیٹ کرافٹ میں رہنما کا کام نہیں دیتا،

ان کی بات سے میں جو سمجھا وہ یہ تھا کہ اگر وہ لوگ سمجھ لیتے کہ اسلام کا اصل نظام کیا ہے؟ اسکا معاشی نظام کیا ہے؟ معاشرت کن خطوط پر استوار ہوتی ہے، اس کے پیچھے کیا فلسفہ کارفرما ہے۔ وہ جب اسے اس کی ساری فلاسفی کے ماتحت سمجھ لیتے تو اسے اپنائے بغیر نہ رہ سکتے، انہیں اسے اپنانے میں دقّت بھی نہ ہوتی بلکہ اپنے نظام کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے اور آئندہ پیش آنے والی دقتوں، مشکلوں اور رکاوٹوں سے بچانے میں مدد ملتی ____ کیونکہ کمیونسٹ نظام میں جب خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے، استحصالی طبقوں کا سایہ دور ہو جاتا ہے ____ تو شخصی ملکیت،

سماجی حیثیت، منافع اور سب سے بڑھ کر INCENTIVE کا مسئلہ اسے پریشان کرتا ہے،
سرمایہ داری نظام میں تو منافع کا حصول INCENTIVE ہے جو اسے کام پہ اکساتا، مصروف رکھتا اور محنت پر آمادہ کرتا ہے مگر کمیونسٹ معاشرے میں یہ شخصی مسابقت کا جذبہ نہیں ہوتا ——— وہاں کا کام کرنے والا سوچتا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ کام کروں تو کیوں، کس کے لئے ——— اس کا جواب ان کے فلسفے میں نہیں ہے۔

اسے محض آخرت کا فلسفہ حل کر سکتا ہے، زندگی کے تسلسل کا فلسفہ آمادہ کر سکتا ہے اور اس کے لئے خدا، رسول اور وحی پر ایمان لانا ہوتا ہے جو سب مسائل حل کر دیتا ہے،

اگر وہ اس سارے فلسفے کو سمجھ کر اپنا لیتے اور یہ کہتے اور شاید اس میں حق بجانب ہوتے کہ اصل مسلمان تو ہم ہیں ——— ہم اسی کروڑ سے زیادہ دنیا کی سب سے بڑی مسلمان آبادی ہیں، آؤ سب مسلمانو آؤ انسان پر انسان کے استحصال کو ختم کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دو، ہم ساری دنیا سے یہ استحصالی نظام ختم کر دیں ——— تو اس کا کسی کے پاس کیا جواب ہوتا' ان کا یہ دعویٰ ساری دنیا کے مسلمانوں اور ساری دنیا کی مسلمان مملکتوں اور ان کے نظام ہائے مملکت کے لئے خطرے کا اتنا بڑا الارم ہوتا کہ جس سے چھٹکارا ان کے بس کی بات نہ ہوتی، نہ ان میں سے کسی کے پاس اس کی طاقت تھی اور نہ رد کرنے کا جواز ———

ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو کہ میرا چین جانا آخری مرحلہ تک پہنچ کر ممکن نہ ہو سکا۔

قدرت اللہ شہاب جیسے لوگ جو دور ایوبی میں کلیدی حیثیت کے مالک تھے بفضلِ خدا زندہ ہیں، ان کے حافظے میں یہ تو محفوظ ہے کہ اس دور میں پرویز صاحب نے جماعت اسلامی کے متعلق کیا مشورہ دیا تھا [پچھلے دنوں جنگ میں ایسی ایک خبر چھپی تھی] شاید انہیں یہ بھی یاد ہو کہ ایسی بھی کوئی بات ہوئی تھی میں مضمرات اور امکانات کی بات نہیں کر رہا واقعہ کے متعلق اشارہ کر رہا ہوں ———

وقت بہت سے زخم بھر دیتا ہے، بہت سی باتیں بھلا دیتا ہے، بہت سے ایسے احباب میری نظروں میں ہیں جو ان سے ملتے رہے، ان کا قرب بھی انہیں حاصل تھا، وہ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگوئیں بھی کرتے رہے انہوں نے ان سے اکتسابِ فیض بھی کیا، بہت کچھ سیکھا، ——— پیشتر اس کے کہ وقت کا مرہم زخم بھرے میری ان سے درخواست ہے کہ پرویز صاحب کی شخصیت کے جس جس پہلو پر روشنی ڈال سکتے ہیں ڈالیں، بلاشبہ انکی شخصیت کے اتنے زیادہ روشن پہلو تھے کہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ورنہ میں ان کے متعلق ناصر کاظمی کے لفظوں میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں'

ے
ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہو گا

——— ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے مرکزی درسگاہ تو ادارۂ طلوع اسلام (B/25۔ گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آجکل) ہر جمعہ کی صبح 9 بجے شروع ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر بہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔

کراچی: ہر جمعہ ½9 بجے صبح دارالزہرہ بالائی منزل بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲ سرحد روڈ (کراچی صدر)

گجرات: ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر ۳۶۳۰ + ۳۷۴۰

اوسلو: (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:
JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I OSLO-I
زیر انتظام زاہد صفدر صاحب ٹیلیفون نمبر 306988—674040

فریڈرکستاد: (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام
ARNE SVENDSENS-GATE-1, 1600 FREDRIKSTAD,
NORWAY TEL: (032) 10287/22802

لندن: (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار ۲ بجے بعد دوپہر بمقام
47 HURLEY ROAD GREEN FORD
MIDDLE SEX TEL: 01—578—5631

برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD 38-3BH
(BIRMINGHAM)

ٹورنٹو (کینیڈا): ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح 335 DRIFTWOOD
AVE: #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT:)
M3N-2P3, TEL: (416) 661—2827

ملتان: جمعہ ۱۰ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون نمبر (۳۱۰۷۱)

لندن یوکے	ہر ماہ کے دوسرے اتوار	39 MANSELL RD GREENFORD MIDDLE SEX TEL: 01—575—5862

اور ذیل کے مقامات پر عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لاہور	ہر جمعہ 9 بجے صبح	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ نزد پولیس سٹیشن فون نمبر: ۸۸۰۸۰۰ (بذریعہ وی سی آر (V-C-R))
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ½2 بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No, 553—1896
پشاور چھاؤنی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWAR STADIUM) باڑہ روڈ فون: ۷۲۶۵۹
پشاور	جمعہ 9 بجے صبح	شیریں محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن

نام بزم طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف
مردان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف ۔ محمود علی صاحب ۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ ۔
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	ج ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس ۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی ، مکان نمبر ۴ ۔ نظامی منزل
فیصل آباد	جمعہ ۳½ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک ، ب/ ۲۳ پیپلز کالونی ۱ فون نمبر :- ۴۲۸۵۵
ہنگو	جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۷)
پنجکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
بہاولپور	جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ ۔ غنی پورہ ۔ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب ۔ ۱ ۔ بائی پاس روڈ بہاولپور
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطے کے لئے : ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر ۔ نوغی روڈ ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر ماہ کا پہلا جمعہ بعد نماز جمعہ درسِ قرآن کریم بذریعہ وی سی آر ہر ماہ کے بقیہ جمعہ بعد نماز جمعہ حسب معمول کیسٹ پر	دفتر بزم ، ملحق رہائش گاہ : چودھری مقبول شوکت صاحب گل روڈ (سول لائنز)
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۲۰/۱ ۔ بی ۔ بھمبر روڈ ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	(۱) جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ : صلاح الدین صاحب ۔ واقع L-K-34 کہیال (ایبٹ آباد)
//	(۲) اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-356 گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بوریوالہ	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نماز جمعہ	بمکان محمد اسلم صابر ۔ مرضی پورہ گلی نمبر ۵ تیسرا چوک ملتان روڈ بوریوالہ
سرگودھا	ہر جمعہ صبح ۹ بجے	رہائش گاہ ارشد محمود ارشد ۶۰/A سول لائن ریلوے روڈ سرگودھا (جو مابین خیام سینما اور شمع سینما بین ریلوے روڈ پر واقع ہے) (فون نمبر ۴۷۱۶)

افکارِ پرویز کی صدی (مسلسل)

موصوف نے فرمایا ــــــ یہ تھی وہ قوم جو انسانیت کے معلم اعلیٰ جناب محمد رسول اللہ کے انسان ساز ہاتھوں سے وجود میں آئی۔ وہ قوم جس کی تخلیق وحدتِ افکار و کردار پر مبنی تھی اس لئے اس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا کہ اختلاف و تفرقہ اس کے قوام کے منافی تھا۔ لیکن تاریخ اس سے بڑی بوالعجبی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ یہی قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ اختلافات کی مظہر اور تفرقہ انگیزی کا پیکر ہے۔ اس قوم کی بنیاد عقیدہ کی وحدت پر تھی لیکن عقائد ہی کے اختلافات سے ان میں کہنے کو بہتّر اور درحقیقت بہتّر سو فرقے موجود ہیں۔ اس قوم کی تشکیل وطنی اور نسلی امتیازات کو مٹانے سے ہوئی تھی۔ لیکن آج وہی مِلّت۔ واحدہ نسلوں اور وطنوں کے اختلافات سے سینکڑوں اقوام میں بٹ چکی ہے اور یہ اس نمط کہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ اور ایک قوم کو دوسری قوم سے بُعد و مفاکرت ہی نہیں بلکہ عداوت اور مناصمت ہے۔ ۔۔۔۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا انہیں پاس نہیں

۱۹۴۹ء

جنوری ۱۹۴۹ء

ماہ جنوری ۱۹۴۹ء کے صفحہ اوّل پر مندرجۂ ذیل عبارت ثبت ہے:۔

۱۲۔ ربیع الاوّل کے اس یوم مقدس کی یاد میں جب فاران کی چوٹیوں سے اُس آفتاب جہاں تاب کا طلوع ہوا جس کی رحمت و ہدایت کی روشنی تمام کرۂ ارض کی تاریکیوں کے لئے پیامِ سحر تھی۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حسنِ ازل وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دِل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دوجہاں، وہ محمدؐ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درودِ لا محدود

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلیٰ نَبِیِّنَا مُحَمَّد اختم المرسلین، رَحْمَۃً لِلعالمین، شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیرًا، وَّدَاعِیًا اِلیَ اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیرًا

آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ ست

لمعات

اس ماہ کے لمعات میں مجلسِ مقننہ کے صدر مسٹر تمیز الدین خاں نے مسٹر چالوڑ پادھیا کے اسلامی نظام کے نفاذ پر شکوک و شبہات کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس پر تبصرہ کے بعد محترم پرویز صاحب نے لکھا:-

جب مسٹر چالوڑ پادھیا نے اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا تو اس کا جواب یہ تھا کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو ہمارے متعلق کسی غلط فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ اس باب میں کہ ہمارا آئین کیا ہوگا اور نہ اس میں کہ اس آئین میں غیر مسلموں کو کیا حقوق و مراعات حاصل ہوں گے۔ اوّل الذکر صورت میں اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کا نظام قرآنی خطوط کے علاوہ کسی اور نہج پر متشکل ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ثانی الذکر صورت میں اسلئے کہ قرآن نے واضح طور پر متعین کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا ضروری ہے۔ اگر حزبِ مخالف کے محترم لیڈر کو خود اس نظام کے مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں تو میں انہیں بتائے دیتا ہوں کہ اس نظام میں غیر مسلم کی جان کی اُسی طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح ایک مسلمان کی۔ ان کی عزت و ناموس کا اسی طرح احترام کیا جائے گا۔ جس طرح ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت و آبرو کا احترام کریں گے۔ ان کے اموال و املاک اسی طرح محفوظ رہیں گے جس طرح مسلمانوں کے۔ انہیں اپنے شخصی قانون (بیاہ شادی، رسم و رواج وراثت وغیرہ) میں پوری پوری آزادی ہو گی۔ ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائیگی حتیٰ کہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت ہم اپنے خون سے کریں گے۔ غیر مسلموں کی حفاظت کے لئے مسلمان سپاہی میدانِ جنگ میں اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں گے۔ غرضیکہ ان کی ہر محبوب متاع کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور اس سے ان پر کوئی احسان نہیں رکھا جائے گا کیونکہ یہ ہمارے خدا کی طرف سے ہم پر عائد کردہ فریضہ ہے۔

اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنے خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ یہ ہیں وہ تحفظات

جو اسلامی ضابطۂ قانون نے ان کے لئے متعین کر رکھے ہیں اور جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدّل
کے ہم مجاز نہیں ہیں۔

مجھے امید ہے کہ حزبِ مخالف ان تحفظات سے مطمئن ہوگا۔ اور اگر اس پر بھی ان کا
اطمینان نہیں تو ہم یوں بھی تیار ہیں کہ جو حقوق و مراعات ہندوستان میں مسلمانوں کو دیئے
جائیں وہی ہم پاکستان میں ہندؤوں کو دے دیں گے! کونسی صورت آپکو پسند ہے؟

یہ تھا وہ جواب جو مسلمانوں کے نمائندہ کی طرف سے ان غیر مسلموں کو ملنا چاہیئے تھا۔ لیکن
یہ جواب کون دیتا!

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے — مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

نگہِ بازگشت

نگہ بازگشت کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے گذشتہ چھ سالوں
کا جائزہ لیتے ہوئے اربابِ حل و عقد کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ

۱۔ بھک سے اڑ جانے والے جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے تمام حالات
کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اسباب و علل کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے۔ جو جو غلطیاں
ہم سے سرزد ہوئی ہیں ان کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کیا جائے اور اس طرح انہیں
آئندہ اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۲) اس خطۂ ارض کے تحفظ و استحکام کا پورا پورا سامان کیا جائے جسے اللہ نے اپنی
ذرّہ نوازیوں کے صدقہ ہماری وراثت میں دے دیا ہے اور جس سے ہمیں ایسی امکانی
قدرت حاصل ہوئی ہے کہ ہم چاہیں تو یہاں قرآنی تصوّرات کے مطابق اپنی دنیا
تشکیل کر لیں۔

(۳) منافقین (قوم پرست مسلمانوں) کے اس طائفہ کو جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم
کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر پہنچ چکا ہے اور اب ناصحین مشفقین کے
لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے۔ جلد سے جلد بے نقاب
کر کے اپنوں سے الگ کیا جائے۔

(۴) جو نالائق اور بددیانت گروہ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسندِ اقتدار پر متمکن
ہو چکا ہے اسے اسکی صحیح قدر و قیمت کا آئینہ دکھا کر اس کے اصلی مقام تک لوٹا
دینے کا انتظام کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی تطہیرِ فکر اور تربیتِ
قلب اس انداز سے کی جائے کہ وہ حکومت کے بارِ عظیم کے اہل ہو جائیں۔

(۵) گذشتہ حوادث و زلازل نے قوم کی اقتصادی حالت کو جس درجہ پست کر دیا ہے اس کا
صحیح اندازہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع پر غور کیا جائے۔

(۶) اس انقلاب کو جو اس وقت ضمیرِ عوام میں پہلو بدل رہا ہے، صحیح خطوط پر متشکل کر کے ایسی صورت پیدا کی جائے کہ یہ انقلابی روح، صحیح قیادت اور متعین منزل کے فقدان سے تعمیری نتائج مرتب کرنے کی بجائے تخریب و اختلال کا موجب نہ بن جائے۔ اس کے لئے عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت، منزلِ مقصود کی واضح اور غیر مبہم تعیین اور اس تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم کی روشن نشاندہی کی جائے۔

(۷) اربابِ اقتدار کو بتایا جائے کہ وہ اپنا نصب العین جذبۂ حکومت کی تسکین کے بجائے فریضۂ خدمت کی ادائیگی قرار دیں اور عوام کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ اس اہم حقیقت کو بھی فراموش نہ کریں کہ ان کے صرف حقوق ہی نہیں بلکہ کچھ فرائض بھی ہیں اور حقوق و مواجب کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فرائض کو بطریقِ احسن بجا لائے۔

(۸) جو خطرہ اس وقت سر پر منڈلا رہا ہے اس کی مدافعت کے لئے پوری کی پوری قوم کو تیار کر دیا جائے اس لئے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو ہم بھی نہ رہ سکیں گے۔

(۹) اور ان مساعی کا ماحصل یہ ہو کہ جس غرض کے لئے یہ زمین کا ٹکڑا ہم نے حاصل کیا ہے (یا بالفاظِ صحیح ہمیں اس مبداءِ فیض و کرم کی موہبت سے عنایت ہوا ہے) وہ غرض بطریقِ احسن پوری ہو جائے اور وہ غرض اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس خطہ زمین میں بسنے والا مسلمان تمام دنیا کی غیر فطری غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر فقط ایک اللہ کا محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکے اور اس طرح پھر سے اس آئینِ کہن کو تازہ کر دے جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے۔

سلیم کے نام چوتھا خط محترم پرویز صاحب نے اس خط میں، طلاق، حلالہ، عدت نابالغ سے نکاح عورت کو مرد کی طرح طلاق دینے کے حق پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

فروری ۱۹۴۹ء تلمیحاتِ اقبالؒ (قرآن کریم سے) اس موضوع پر ریڈیو پاکستان کراچی سے تقریر کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:-

کسی مفکر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں اس لئے کہ جب تک اس کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو جائے جس سے اس کے فکر کی شاخیں پھوٹی ہیں، اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں علامہ اقبالؒ کی ہستی منفرد نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اس

میں کسی ظن و تخمین اور قیاس وگمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بایں ہمہ، اسے ہماری لذّتِ نکات آفرینی کہئے یا ذوقِ تجسّس، کہ پیامِ اقبال سے دلچسپی رکھنے والے گزشتہ دس برس سے اسی تحقیق و جستجو میں سرگرداں وحیراں پھر رہے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے فکر کے ماخذ کیا تھے۔ علامہ اقبالؒ کا پیغام، سب سے پہلے منضبط صورت میں، اسرار و رموز" میں ہمارے سامنے آتا ہے جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے، اس ذات اقدس و اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی بارگاہ میں ایک التجا پیش کی ہے جو ان کے عشق کی منتہٰی، ان کی آرزؤں کا محور، اور انکی تمنّاؤں کا مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں ؂

گر دلم آئینہ، بے جوہر است　　دُر بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے۔ تو اے ختمِ رسل، دانائے سُبل

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں رازِ خارم پاک کن

یہیں تک نہیں بلکہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

جن کی نگاہیں قلبِ اقبالؒ پر ہیں وہ اس شدّتِ احساس کا خوب اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انہوں نے اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر روا رکھی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے کہ اقبالؒ کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اور ان کی نگاہیں کس آفتابِ حقیقت سے مستنیر تھیں۔ میرے نزدیک اقبالؒ کی عظمت وعقیدت اسی بناء پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا۔ اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ انکی مئے سخن، براہِ راست خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آیا کرتی تھی اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپکو ان کے فہمِ قرآن کے کسی مقام سے اختلاف ہو لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے فکر کی اساس کچھ اور تھی۔

حکومت اور مملکت

حکومت اور مملکت کے عناصرِ ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا: مملکت (STATE) ایک مجرد اصطلاح ہے جس کا مفہوم چند الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کے عناصرِ ترکیبی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد (جسے ملّت کہیئے) اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین کرتے ہیں اور اس نظام کو نافذالعمل کرنے کے لئے اسے آئینی شکل دیتے ہیں جس کے زندہ نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ اس سرزمین، ملّت، نظام، اور آئین کے تصوراتی مجموعہ کو مملکت کہتے ہیں اور حکومت نام ہوتا ہے اس مشینری کا جو اس آئینی نظام کو نافذ کرتی ہے۔

انسانی ہیئت اجتماعیہ کے ابتدائی ادوار میں حکومت اور مملکت میں بالعموم کچھ فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ مملکت نام ہوتا تھا سلطنت کا اور حکومت عبارت ہوتی تھی سلطان کی ذات سے۔ چنانچہ سلطنتیں، سلاطین کی شخصیتوں سے قائم یا ختم ہوتی تھیں۔

قرآن کریم نے دنیا کو سلطنت کی جگہ خلافت کا تصور دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں اس سے پہلے کہیں کہیں تصورِ جمہوریت کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے تھے۔ لیکن خلافت کے انقلابی تصور کو اپنی منضبط شکل میں سب سے پہلے قرآن ہی نے پیش کیا ہے۔ قرآن کی رو سے اصل شے جماعت یا ملت ہے۔ ملت مسائل اجتماعیہ سے عہدہ برآء ہونے کے لئے اپنا مرکزی ادارہ قائم کرتی ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ حکومت بدلتی رہتی ہے۔ افرادِ ملت متاعِ ملی کے محافظ و امین ہونے کی جہت سے۔ ملت کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور ملت، آئینِ الٰہیہ کی پاسبان ہونے کی جہت سے، خدا کے سامنے جوابدہ)۔

باب المراسلات

باب المراسلات میں ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

جس زمانہ میں احرار کی تحریک زوروں پر تھی، ان کی عام روش یہ ہوتی تھی کہ جونہی کسی نے ان کے خلاف کوئی بات کہی تو انہوں نے چلّا کر کہہ دیا کہ یہ "مرزائی" ہے۔ بس اس کے بعد اس بیچارے کو جان بچانی مشکل ہو جاتی تھی۔ یہ ذہنیت احراریوں تک ہی محدود نہ تھی۔ ہم لوگوں کی عام طور پر یہ حالت ہو رہی ہے کہ جس بات کو ہم درست سمجھتے ہیں اگر کوئی اس کی موافقت میں کچھ کہتا ہے تو ہم ہر جگہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسے حق و صداقت کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم سوچیں کہ اس کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کیا دلائل و براہین ہیں، فوراً نعل بہ آتش ہو جاتے ہیں پھر اس کی طرف ذلیل سے ذلیل مقاصد (MOTIVES) منسوب کرکے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مخالفت کو ختم کر دیا۔

یہ ہندوستان ہے

ہندوستان کے اخبارات کی اطلاعات پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

خبر: (۱) سالم سنٹرل جیل (صوبہ مدراس) کے ۳۲ قیدیوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس پر انہیں قیدخانہ کے قانون کی دفعہ ۵۲ کے ماتحت، دو دو ماہ سے لے کر چھ چھ ماہ تک مزید قید کی سزائیں دی گئیں۔

(فری پریس جرنل ۱۲/۸)

تبصرہ:۔ بھوک ہڑتال وہ حربہ ہے جسے مسٹر گاندھی نے عام کیا اور کانگرس اسے ہمیشہ اہمسا کا بلند ترین اصول قرار دیتی رہی۔ آج وہی کانگریسی حکومت اسے سنگین جرم

قرار دے رہی ہے اور اس کی پاداشن میں سزائیں دی جا رہی ہیں۔ اس وقت یہ حربہ انگریزوں کے خلاف تھا اس لئے انسانیت کا بلندترین اصول آج وہ اپنے خلاف ہے۔ اس لئے سنگین جرم! یہ ہے نتیجہ زندگی کو مستقل اقدار سے الگ رکھنے کا!

خبر:- (۲) میں، مسٹر....... کی تجویز سے اختلاف کرتا ہوں...... ہندوستان سے، ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفرقہ، ترقی کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم (فقط) "ہندوستانی" ہیں موجودہ تصادم کی جگہ خوش حالی اور یکسگالی آ جائے گی۔"

(مسٹر ایم۔ رئیس، ایچ، قریشی کا خط جو ۳۰ نومبر ۴۸ء کے اسٹیٹسمین میں شائع ہوا)

تبصرہ:- اس خط سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

خبر:-(۳) حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر جمعیت العلماء اجلاس امروہہ کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرماتے ہیں:- تقسیم ہند کے بعد ہندو فرقہ پرستی پورے شباب پر ہے اور صحیح بات کہنے والا ہندوستانی آج بے اثر ہو چکا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی نے مہاتما گاندھی جیسی بے نظیر شخصیت کی جان لے لی اور ہندوستان کو نہیں بلکہ دنیا کو سچے رہنما سے محروم کر دیا۔ اس لئے آج ہندوستان میں صحیح بات کہنا بہت مشکل ہے مگر سچ کہنا چاہیئے اس لئے کہ کبھی نہ کبھی وہ قبول کیا جاتا ہے۔ آج ہندوستان میں فرقہ پرستی کا زہر کانگریس کے اندر اور باہر ترقی کر رہا ہے۔ حکومت ہند کے سامنے اس وقت دو مشکلات ہیں ایک طرف وہ دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ ہندوستانی حکومت غیر مذہبی حکومت ہے دوسری طرف وہ ہندو پرستی سے خائف ہے لیکن اس کی یہ مذبذب حالت مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔

تبصرہ:- یہ لدھیانوی صاحب وہی بزرگ ہیں جنہیں کانگریس کے مقابلہ میں لیگ میں شرکت پر خالص شرعی اعتراض تھا۔

خبر:-(۴) یہاں کے مسلمان اگر انڈین یونین کے وفادار رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ ہندی کو اپنائیں اور ہندوستان کی تہذیب اختیار کریں۔ ان کے اپنے تمدن اور زبان کی اب ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ (صدق لکھنؤ $\frac{12}{48}$ ۳)

تبصرہ:- یہ صوبہ متحدہ کے کانگریس اور صوبہ اسمبلی کے اسپیکر راج رشی ٹنڈن جی نے اپنی لکھنؤ اور دہلی کی تقریروں میں بار بار فرمایا اور ایسا وہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ بھولے بھالے مسلمان اب جا کر سمجھے کہ ان کا اطمینان قلب قبل از وقت تھا جب وہ واقعۂ حیدرآباد کے بعد سنپت جی وزیراعظم یو پی کی زبان سے یہ سن کر خوش ہو گئے تھے۔ "اب مسلمانوں سے وفاداری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں"۔ ابھی تو اپنا تمدن اور اپنی زبان ترک کرنے

کے مطالبات باقی ہیں!

معاصر الجمعیت دہلی کے صفحات میں ایک مراسلہ:۔

خبر: (۵) جیسا کہ اندیشہ تھا آخر وہ گھڑی آ کر ہی رہی اور کل راجستھان یونین کا حکم آ گیا کہ ٹونک کے محکمۂ شرعیت کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک انفرادی اور اجتماعی جو کوشش کی گئی تھی اور جمعیت علماء ہند نے بھی اس میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ افسوس وہ بے سود رہا۔ ان چھ ماہ میں تعطیلِ جمعہ اور اسلامی تعطیلات کی منسوخی، ذبیحہ گاؤ کی بندش اور بہت سے ملازموں کی برطرفی اور اردو کی جگہ ہندی کو مسلمان پورے صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ لیکن اب محکمۂ شرعیت کے خاتمہ نے ان کو حد سے زیادہ روحانی تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔ (جاری ہے) (محمد اسلام صاحب)

احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کی جنرل باڈی کی میٹنگ کی روئیداد

دی احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لیمیٹڈ کے نوٹس نمبر ACHS/C/5 مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ء کے مطابق ایک جنرل باڈی میٹنگ سوسائٹی کے رجسٹرڈ آفس میں بتاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۸۵ء بوقت ۴ بجے سہ پہر محترم حبیب الرحمٰن صاحب پریذیڈنٹ احباب سوسائٹی کے زیرِ صدارت منعقد کی گئی۔ اس موقع پر ممبران نے پہلے علامہ پرویزؒ (باباجی) بانی مبانی سوسائٹی ہذا کیلئے فاتحہ خوانی کی اور ازاں بعد صاحب صدر نے اختصار کے ساتھ ان مشکلات اور رکاوٹوں کا تذکرہ کیا جو اسے موجودہ پوزیشن پر لانے میں منتج ہوئی ہیں کہ ممبران کو قطعات زمین کی الاٹمنٹ کی جا رہی ہے تاکہ ان کے ڈیویلپمنٹ کے کام کی جلد از جلد تکمیل ہو سکے۔ اس کے بعد آنریری سیکرٹری نے جنرل باڈی کو مینجنگ کمیٹی کے ان فیصلوں کی نشاندہی کی جو اسی روز صبح کو طے پائے تھے۔ اور جن کی بناء پر جنرل باڈی نے حسب ذیل لائحہ عمل پلاٹس کے الاٹمنٹ کے بارے میں منظور کیا (۱) تمام پلاٹس الاٹمنٹ کے مقاصد کے لئے ایک کنال کے متصور ہوں گے (۲) بلاک اے میں ۱۳ عدد اور بلاک بی میں کل ۱۶ عدد کارنر پلاٹس شمار ہوں گے۔ علاوہ ازیں پلاٹ نمبر ۱ بلاک اے، میں اور نمبر ۱۱، ۳۴ بلاک بی میں "پریولیجڈ" پلاٹ شمار ہونگے۔ کارنر پلاٹس کے لئے مبلغ/-۱۰۰۰ روپے "پریولجڈ" پلاٹس کے لئے/-۵۰۰ روپے ممبران متعلقہ سے بطور اضافی چارج لئے جائیں گے۔ (۳) جن ممبران نے ڈیویلپمنٹ چارجز کے نصف (/-۲۰۰۰۰) سے اب تک بقدر /-۵۰۰۰ روپے کم ادا کئے ہیں وہ سردست عارضی الاٹی متصور ہونگے بشرطیکہ وہ یہ کمی ۳۱ اگست تک پوری کر دیں (۴) جن ممبران نے ڈیویلپمنٹ کے حساب میں کوئی قسط بھی ادا نہیں کی انہیں اس سکیم میں الاٹمنٹ سے خارج کیا گیا ہے (۵) جو ممبران کسی وجہ سے مذکورہ رقوم پندرہ سولہ ہزار کی حد تک فوری طور پر ادا نہ کر سکیں وہ اس پہلا ڈیویلپمنٹل الاٹمنٹ سے خارج سمجھے جائیں گے لیکن اگر وہ ۸۵/۸/۳۱ تک یہ ادائیگی کر دیں تو الاٹمنٹ کے اگلے (PHASE) میں شامل کر لئے جائیں گے ورنہ وہ بالکل (DEBAR) کر دیئے جائیں گے۔ مزید تفصیلات اس الاٹمنٹ سے متعلق ٹائپ کر کے ممبران کو ان کے پتوں پر بھیجی جا رہی ہیں اور باہمی گفت و شنید سے "الاٹمنٹ" ایکسچینج" ہو سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی صاحب صدر نے اس میٹنگ کے اختتام کا اعلان فرما دیا۔ منجانب/ عطاء الرحمٰن) ایڈمن آنریری سیکرٹری کوآپریٹو سوسائٹی